تدبرِ قرآن

۳۴
سبا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورتوں کا پانچواں گروپ

سورۂ سبا سے سورتوں کا پانچواں گروپ شروع ہو رہا ہے جو سورۂ حجرات پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں ۱۳ سورتیں ——— از سبا تا الاحقاف ——— مکی ہیں، آخر میں تین سورتیں ——— محمد، الفتح، الحجرات ——— مدنی ہیں۔

ب۔ گروپ کا جامع عمود

مطالب اگرچہ اس گروپ میں بھی مشترک ہیں یعنی قرآنی دعوت کی تینوں اساسات ——— توحید، قیامت، رسالت ——— پر جس طرح پچھلے گروپوں میں بحث ہوتی ہے اسی طرح اس میں بھی یہ تمام مطالب زیر بحث آئے ہیں؛ البتہ نہج استدلال اور اسلوب بیان مختلف ہے اور جامع عمود اس کا اثبات توحید ہے جو اس مجموعہ کی تمام سورتوں میں نمایاں نظر آئے گا۔ دوسرے مطالب اسی کے تحت اور اسی کے تضمنات کی وضاحت کے طور پر آئے ہیں۔

ج۔ سورۂ سبا کا عمود اور اس کے مطالب کا تجزیہ

اس گروپ کی پہلی سورہ، سورۂ سبا ہے۔ اس کا عمود اثبات توحید و قیامت ہے۔ بنیاد اس کی شکر اور اس کے مقتضیات پر ہے اور مخاطب مُترفین قریش ہیں۔ ذیل میں ہم بالاجمال اس کے مطالب کا تجزیہ پیش کرتے ہیں جس سے اس کے تمام اجزاء کا ربط عمود کے ساتھ واضح ہو جائے گا۔

(۱-۹) تمہید، جس میں اللہ تعالیٰ ہی کے سزاوار شکر ہونے کی دعوت ہے۔ اس لیے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے اور آخرت میں بھی تمام اختیار و اقتدار اسی کا ہوگا۔ اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے اس وجہ سے نہ کسی کا کوئی عمل اس سے مخفی رہے گا، نہ کوئی کسی کو اپنی باطل سفارش سے چھڑا سکے گا۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آخرت نہیں ہے وہ سخت گمراہی میں ہیں۔ آخرت ایک حقیقت اور خدا کی صفات کا لازمی تقاضا ہے۔ جن کے اندر علم کی رمق ہے وہ جانتے ہیں کہ قرآن جس توحید و قیامت کی دعوت دے رہا ہے وہ بالکل حق ہے، صرف بے فکرے اور لاابالی لوگ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ان کی اصلی بیماری یہ ہے کہ انابت اور عبرت پذیری کی صلاحیت ان کے اندر مفقود

ہے۔ اگر یہ صلاحیت ان کے اندر ہوتی تو وہ دیکھ لیتے کہ خدا ان کو جب چاہے اور جہاں سے چاہے پکڑ سکتا ہے۔

(۱۰-۱۴) منکرین قریش کی تنبیہ کے لیے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کی مثال کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی تمام نعمتیں عطا فرمائیں لیکن وہ غرور و استکبار میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ اپنے رب کے شکر گزار و فرمانبردار رہے۔ انھوں نے دنیا کے فتنہ میں مبتلا ہو کر شیاطین کی پیروی نہیں کی بلکہ شیاطین سے بھی اپنی پیروی کرائی۔ جو اپنے رب کی فرمانبرداری کرتے ہیں اللہ تعالیٰ شیاطین کو بھی ان کی غلامی میں دے دیتا ہے اور جو اپنے رب کی ناشکری کرتے ہیں شیاطین ان پر مسلط ہو جاتے ہیں اور ان کو شیاطین کی غلامی کرنی پڑتی ہے۔

(۱۵-۲۱) ملک سبا کی مثال جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خدا کی نعمتیں پا کر جو قومیں خدا کی ناشکرگزاری کے بجائے طغیان و فساد میں مبتلا ہو جاتی ہیں اللہ تعالیٰ ان کو نہایت عبرت انگیز سزا دیا کرتا ہے۔ اہلِ سبا نے اپنے بارے میں ابلیس کے گمان کو سچا ثابت کر دیا جس کی پاداش میں اللہ نے ان کو اپنے تمام افضال سے محروم کر کے ایک افسانۂ پارینہ بنا دیا۔

(۲۲-۲۷) شرک، شرکاء اور شفاعتِ باطل کے عقیدے کی تردید اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ اگر یہ مشرکین بے دلیل، محض اپنی انانیت کے غرور میں، اپنی ضد پر اڑے رہنا چاہتے ہیں تو ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو۔ تم نے اپنی دعوت پہنچا دی۔ اب ان کا فیصلہ اللہ کرے گا۔ وہ ہر چیز سے باخبر اور ہر معاملے کا دو ٹوک فیصلہ کرنے والا ہے۔

(۲۸-۳۳) مخالفین کے اس معارضہ کا جواب کہ ہم اس وقت تک اس قرآن کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں جب تک وہ عذاب نہ دکھا دیا جائے جس کی ہم کو دھمکی دی جا رہی ہے۔

(۳۴-۳۹) منکرین کے اصل سبب انکار کی طرف اشارہ کہ ان کو اس دنیا میں جو مال و جاہ حاصل ہے اس کو وہ خدا کے منظورِ نظر ہونے کی دلیل بنائے بیٹھے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جس طرح اس دنیا میں وہ کامیاب ہیں اسی طرح آخرت میں بھی (اگر وہ ہوئی) وہی فائز المرام رہیں گے۔ حالانکہ اس دنیا کی نعمتیں اللہ تعالیٰ جس کو دیتا ہے آزمائش کے لیے دیتا ہے کہ وہ اس کو پا کر خدا کا شکرگزار بندہ بنتا ہے یا ناشکرا۔ آخرت میں اس کے ساتھ اللہ کا معاملہ اس کے عمل کے مطابق ہو گا۔

(۴۰-۴۳) یہ تنبیہ کہ اپنے جن معبودوں کی حمایت میں یہ لوگ قرآن اور پیغمبر کی مخالفت کے لیے آج آستینیں چڑھائے ہوئے ہیں ان میں سے ملائکہ کا حال یہ ہو گا کہ جب خدا قیامت کے دن ان سے سوال کرے گا کہ کیا یہ لوگ تمھاری پوجا کرتے رہے ہیں تو وہ اس سے فوراً اظہارِ براءت کریں گے اور جواب دیں گے کہ یہ جنوں کو پوجتے رہے ہیں، ہم اس سے بالکل بری ہیں۔

(۴۴-۵۴) خاتمۂ سورہ جس میں پہلے تو اس عظیم احسان کی طرف توجہ دلائی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کی صورت میں ان لوگوں پر فرمایا جو اس سے پہلے قرآن و کتاب سے بالکل ناآشنا تھے، پھر نہایت ناصحانہ انداز میں ان کو معاملے پر سنجیدگی کے ساتھ غور کر کے فیصلہ کرنے کی دعوت دی اور آخر میں یہ دھمکی دی کہ اگر یہ وقت نکل گیا تو پھر ہمیشہ کے لیے پچھتاؤ گے لیکن گزرا ہوا وقت ہاتھ نہیں آئے گا۔

سُوْرَةُ سَبَاٍ (۳۴)

مَكِّيَّةٌ ———— اٰيَاتُهَا ۵۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۹

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَلَهُ
الْحَمْدُ فِي الْاٰخِرَةِ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ① يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي
الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاۗءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ۭ
وَهُوَ الرَّحِيْمُ الْغَفُوْرُ ② وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ۭ
قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ عٰلِمِ الْغَيْبِ ۚ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ
فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ
مُّبِيْنٍ ③ لِّيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ
مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ④ وَالَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰۗىِٕكَ
لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ⑤ وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْٓ
اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ ۙ وَيَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ
الْحَمِيْدِ ⑥ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰي رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ
اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ⑦ اَفْتَرٰى عَلَي

اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ بَلِ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ ۝۸ اَفَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ۝۹ ع

ترجمۂ آیات ۱-۹

شکر کا حقدار وہ اللہ ہی ہے جس کا وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور اسی کی حمد آخرت میں بھی ہوگی اور وہی حقیقی حکیم و خبیر ہے۔ وہ جانتا ہے ہر اس چیز کو جو زمین کے اندر داخل ہوتی ہے اور جو اس سے برآمد ہوتی ہے اور جو آسمان سے اترتی ہے اور جو اس میں چڑھتی ہے اور وہی رحم فرمانے والا اور بخشنے والا ہے۔ ۱-۲

اور جنھوں نے کفر کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم پر قیامت نہیں آنے کی۔ کہہ دو، ہاں میرے خداوند عالم الغیب کی قسم، وہ ضرور تم پر آکے رہے گی! اس سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز مخفی نہیں ہے، نہ آسمانوں اور نہ زمین میں، اور نہ اس سے کوئی چھوٹی چیز اور نہ بڑی۔ مگر وہ ایک واضح کتاب میں مرقوم ہے، تاکہ وہ ان لوگوں کو صلہ دے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے۔ وہی لوگ ہیں جن کے لیے مغفرت اور رزق کریم ہے۔ اور جو ہماری آیات کو زک پہنچانے کی سعی میں سرگرم ہیں وہی ہیں جن کے لیے دردناک عذاب کا خاص حصہ ہوگا۔ ۳-۵

اور جن کو علم عطا ہوا ہے وہ، اس چیز کو جو تمھاری طرف تمھارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے، سمجھتے ہیں کہ یہی حق ہے اور وہ خدائے عزیز و حمید کے راستہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ ۶

اور جنھوں نے کفر کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ کیا ہم تم کو ایک ایسا آدمی دکھائیں جو تم کو یہ خبر دے رہا ہے کہ جب تم بالکل ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو از سر نو ایک نئی خلقت میں اٹھائے جاؤ گے! کیا اس

نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے یا اس کو کسی قسم کا جنون ہے! بلکہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہی عذاب اور نہایت دور کی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ ۷-۸

کیا انھوں نے اپنے آگے اور پیچھے آسمان و زمین پر نظر نہیں ڈالی! اگر ہم چاہیں تو ان کے سمیت زمین کو دھنسا دیں یا ان پر آسمان سے ٹکڑے گرا دیں! بے شک اس کے اندر ہر اس بندے کے لیے بہت بڑی نشانی ہے جو متوجہ ہونے والا ہو!

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَلَہُ الْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَۃِ وَھُوَ الْحَکِیْمُ الْخَبِیْرُ (۱)

اس سورہ کی بنیاد شکر اور اس کے مقتضیات پر ہے

اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سورہ کی بنیاد شکر اور اس کے لوازم و مقتضیات پر ہے اور سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں یہ حقیقت بھی واضح ہو چکی ہے کہ شکر ہی پر توحید اور پھر پورے دین کی عمارت قائم ہے۔ منعم کے شکر کا واجب ہونا انسانی فطرت کی بدیہیات میں سے ہے۔ انسان پر جس کا بھی کوئی احسان ہوتا ہے وہ اس کا ممنون و شکرگزار ہوتا ہے۔ اگر کوئی اپنے محسن کا شکرگزار نہ ہو تو وہ لئیم و کمینہ ہے۔ اسی اصل پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ آسمان و زمین کی تمام نعمتیں، جن سے انسان ہر لمحہ متمتع ہو رہا ہے اور جن کے اوپر ہی اس کے بقا کا انحصار ہے، کس کی پیدا کردہ اور کس کے قبضۂ قدرت میں ہیں؟ یہ سورج، یہ چاند، یہ ابر، یہ ہوا، یہ تارے اور سیارے کس کے بنائے ہوئے ہیں؟ یہ زمین، یہ دریا، یہ پہاڑ، یہ چرند و پرند، یہ اشجار و انہار اور یہ سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ ظاہر ہے کہ ان سوالوں کا صحیح جواب یہی ہے کہ یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ ہی کی پیدا کردہ، اسی کی مملوک اور اسی کے دستِ تصرف میں ہیں۔ پچھلی سورتوں میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ ان سوالوں کا یہی جواب قرآن کے کٹر سے کٹر مخالفین بھی دیتے تھے۔ اس آیت میں قرآن نے اسی بدیہی حقیقت کی یاددہانی کی ہے کہ وہی اللہ جو آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا خالق و مالک ہے وہی ان تمام مخلوقات کے شکر کا حقیقی سزاوار بھی ہے جو اللہ کی پیدا کی ہوئی ان چیزوں سے متمتع ہو رہی ہیں۔ اس شکر کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ سب اسی کی عبادت و اطاعت کریں اور اس عبادت و اطاعت میں کسی دوسرے کو شریک نہ کریں اس لیے کہ کسی دوسرے کو ان چیزوں کے خلق یا ان کی تدبیر میں کوئی دخل نہیں ہے۔ دوسروں سے انسان کو کوئی فیض

پہنچتا ہے تو محض ایک واسطہ و ذریعہ کی حیثیت سے پہنچتا ہے۔ اس وجہ سے اگر ان کا کوئی حق انسان پر قائم بھی ہوتا ہے تو وہ خدا کے حق کے تحت ہوتا ہے نہ کہ خدا کے حق سے بالاتر یا اس کے برابر۔

شکر کے لازم کا ظہور آخرت میں

وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْآخِرَةِ: اوپر کے ٹکڑے میں اللہ تعالیٰ کے اس حق کا ذکر تھا جو اس دنیا کی زندگی میں اس کے ہر بندے پر قائم ہوتا ہے۔ اب اس ٹکڑے میں اس کے اس حق کا ذکر ہے جو آخرت میں آشکارا ہوگا۔ فرمایا کہ اسی کی حمد آخرت میں بھی ہوگی۔ اس ٹکڑے سے کئی باتیں واضح ہوئیں۔

ایک یہ کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ربوبیت کا جو اہتمام فرمایا ہے اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کے بعد آخرت کا ظہور ہو۔ اگر آخرت نہ ہو تو یہ تمام ربوبیت بالکل بے معنی و بے غایت ہو کے رہ جاتی ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت متعدد مقامات میں ہو چکی ہے اس وجہ سے یہاں اشارے پر کفایت کیجیے۔

دوسری یہ کہ یہ اہل ایمان کے اس ترانۂ حمد کی طرف اشارہ ہے جو آخرت میں تمام حقائق کے ظہور اور اللہ تعالیٰ کے جملہ وعدوں کے ایفا کے بعد ان کی زبانوں سے بلند ہوگا۔ اس کی طرف سورۂ یونس میں اشارہ ہے: وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (یونس: ۱۰) (اور ان لوگوں کی آخری صدا یہ ہوگی کہ شکر کا حقیقی سزاوار اللہ، عالم کا خداوند، ہے)۔

تیسری یہ کہ یہ شرکا و شفعا کی کلی نفی ہے کہ یہ تمام مزعومہ دیوی دیوتا جن کی شفاعت کی امید پر مشرکین نچنت بیٹھے ہیں، آخرت میں سب ہوا ہو جائیں گے۔ ان میں سے کوئی کسی کے کام آنے والا نہیں بنے گا۔ اس دن مشرکین اپنے معبودوں پر لعنت کریں گے اور معبود اپنے پجاریوں سے اعلان براءت کریں گے۔ سب کی پیشی اللہ واحد کے حضور میں ہوگی۔ اسی کا فیصلہ ناطق ہوگا اور سب پر یہ حقیقت آشکارا ہو جائے گی کہ سزاوار حمد صرف اللہ رب العالمین ہے۔ اس حقیقت کی طرف سورۂ قصص میں یوں اشارہ فرمایا گیا ہے: لَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُولَىٰ وَالْآخِرَةِ ۖ وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (القصص: ۷۰) (وہی حمد کا حق دار ہے دنیا میں اور اسی کی حمد ہوگی آخرت میں اور اسی کے اختیار میں تمام امور کا فیصلہ ہے اور اسی کے آگے تمہاری پیشی ہونی ہے)۔

مذکورہ بالا باتوں کی دلیل صفات الٰہی سے

وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ: یہ اوپر کے تمام دعاوی کی دلیل اللہ تعالیٰ کی صفات سے پیش کی گئی ہے کہ وہ حکیم و خبیر ہے اس وجہ سے لازم ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں اپنے شکر گزار بندوں کو ان کی شکر گزاری کا صلہ دے اور ناشکرے اپنی ناسپاسی کی سزا بھگتیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ دنیا ایک بازیچۂ اطفال بلکہ ایک نہایت ظالمانہ کھیل بن کے رہ جاتی ہے اور العیاذ باللہ یہ ماننا پڑے گا کہ اس کا خالق حکیم نہیں بلکہ ایک کھلنڈرا ہے حالانکہ اس کائنات کا ذرہ ذرہ یہ شہادت دے رہا ہے کہ اس کا خالق ایک حکیم ہے۔ اسی طرح اس کے حکیم ہونے کا یہ بھی تقاضا ہے کہ اس کے بے لاگ عدل کو کسی کی سفارش باطل نہ کر سکے اس لیے کہ اس صورت میں بھی اس کے حکیم ہونے کی نفی ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں وہ خبیر بھی ہے اس لیے کہ

جب اس نے ہر چیز پیدا کی ہے تو ضروری ہے کہ وہ اس کے ایک ایک ذرہ اور ایک ایک حرکت و سکون سے باخبر بھی ہو چنانچہ فرمایا ہے 'اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ' (الملک : ۱۴) (کیا وہ نہیں جانے گا جس نے سب کچھ بنایا ہے) اس کے اس محیطِ کُل علم کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ کسی کے معاملے کا فیصلہ کرتے وقت نہ کسی دوسرے کے علم و خبر کا محتاج ہو اور نہ کوئی اس کو اپنی جھوٹی سفارش سے فریب دے سکے۔

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ ان تمام باتوں کو حصر کے اسلوب میں فرمایا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جب حقیقی خالق و مالک اور حقیقی حکیم و خبیر وہی ہے تو اس کے سوا کوئی دوسرا حمد و شکر کا سزاوار کس طرح ہو سکتا ہے۔

یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْھَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْھَا ؕ وَھُوَ الرَّحِیْمُ الْغَفُوْرُ (۲)

خدا کی صفت خبیر کی وضاحت

یہ اسی صفت 'خَبِیْرٌ' کی وضاحت ہے کہ اس کا علم اس کائنات کے ایک ایک ذرے اور ایک ایک حرکت و سکون کو محیط ہے۔ جو دانہ زمین میں ڈالا جاتا ہے وہ اس سے بھی باخبر ہوتا ہے اور جو پودا اس سے برآمد ہوتا ہے اس کو بھی وہ جانتا ہے۔ اسی طرح آسمان سے جو خیر و شر نازل ہوتا ہے وہ بھی اس کے علم میں ہوتا ہے اور جو چیزیں اس میں صعود کرتی ہیں ان سے بھی وہ آگاہ ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کا علم تمام کلیات و جزئیات کو محیط ہے اور وہ ہر چیز کی نگرانی فرما رہا ہے۔ اس کی مملکت میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی نہ تو اس کے دائرۂ علم سے باہر ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ اس کے کسی گوشے میں اس کے علم و اذن کے بغیر کوئی کسی قسم کی نقل و حرکت یا دراندازی کر سکے۔ علمِ الٰہی کے اس احاطہ کی وضاحت اس مقصد سے کی گئی ہے کہ شرک کے عوامل میں سے ایک بہت بڑا عامل مشرکین کا یہ مغالطہ ہے کہ بھلا اتنی ناپیداکنار کائنات کے ہر کونے اور گوشے، ہر ایک کے قول و عمل اور ہر ایک کے دکھ اور درد سے خدا ہر لمحہ کس طرح واقف رہ سکتا ہے! اس وجہ سے اپنے تصور کے مطابق اس کائنات کے مختلف حصوں کو انھوں نے الگ الگ دیوتاؤں میں تقسیم کیا۔ اس کا تقرب حاصل کرنے اور اس کو اپنی ضروریات سے آگاہ کرنے کے لیے وسائل و وسائط ایجاد کیے۔ جنوں کو آسمان کی خبریں لانے والا مان کر ان کی پرستش کی، فرشتوں کو شفاعت کرنے والا سمجھ کر ان کو دیویوں کا درجہ دیا۔ اس آیت نے ان تمام توہمات پر ضرب لگائی کہ خدا کا علم ہر چیز کو محیط ہے اس وجہ سے کوئی اس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ وہ اپنی پوری کائنات کے سارے نظام پر خود حاوی اور تنہا کافی ہے۔

مشرکین کے ایک مغالطہ کا ازالہ

'وَھُوَ الرَّحِیْمُ الْغَفُوْرُ' یعنی خدا کوئی ظالم اور غیر منصف بھی نہیں ہے کہ اس کو راضی کرنے یا اس کی آفتوں سے اپنے کو بچانے کے لیے کسی دوسرے کی سعی و سفارش کی ضرورت پیش آئے بلکہ وہ نہایت مہربان اور نہایت بخشنے والا ہے۔ اس کی رحمت کو متوجہ کرنے اور اس کی مغفرت حاصل کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ بندہ اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگے اور توبہ و اصلاح کرے۔ یہاں یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ شرک

کے عوامل میں سے ایک اہم عامل مشرکوں کا یہ مغالطہ بھی ہے کہ انھوں نے خدا کا تصور ایک نہایت ہولناک ہستی کی حیثیت سے کیا اور پھر اس کو راضی رکھنے کے لیے انھوں نے اپنے تصور کے مطابق وسائل و ذرائع ایجاد کیے۔ اس ٹکڑے نے اسی واہمہ پر ضرب لگائی ہے۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِیْنَا السَّاعَةُ ؕ قُلْ بَلٰى وَرَبِّیْ لَتَاْتِیَنَّكُمْ ۙ عٰلِمِ الْغَیْبِ ۚ لَا یَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَلَاۤ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكْبَرُ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ (۳)

قیامت خدا کی صفات کا لازمی تقاضا ہے

یعنی جب اللہ حکیم و خبیر ہے، اس کا علم ہر چیز کا احاطہ بھی کیے ہوئے ہے تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ قیامت ضرور آئے لیکن جو ہٹ دھرم ہیں وہ اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں اور بڑے غرور کے ساتھ انکار کرتے ہیں کہ قیامت ہرگز نہیں آئے گی۔

'قُلْ بَلٰى وَرَبِّیْ لَتَاْتِیَنَّكُمْ' جس طنطنہ کے ساتھ منکرین کا انکار تھا اسی زور کے ساتھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بتقید قسم، جواب دلوایا کہ ان کو سنا دو کہ ہاں، میرے رب کی قسم! وہ تم پر ضرور آکے رہے گی۔

'عٰلِمِ الْغَیْبِ ۚ لَا یَعْزُبُ عَنْهُ الاٰیۃ' 'عالم الغیب' 'رَبِّیْ' سے بدل واقع ہے یعنی میرے اس رب کی قسم جو تمام غیب سے واقف ہے، جس سے آسمانوں اور زمین میں، ذرہ کے برابر بھی کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ بلکہ ہر چیز ایک نہایت واضح رجسٹر میں درج ہے۔

اس آیت میں علم الٰہی کی وسعت کا بیان منکرین کی تہدید کے مقصد سے ہے کہ وہ جو کتنے ہوں کہ اس ڈھٹائی سے وہ قیامت کا جو انکار کر رہے ہیں تو یاد رکھیں کہ نہ صرف یہ کہ وہ آئے گی بلکہ ہر ایک کو اپنے ایک ایک قول و عمل کا، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، حساب بھی دینا ہے۔ ساتھ ہی اس میں ایک مغالطہ کا ازالہ بھی ہے وہ یہ کہ منکرین کے نزدیک قیامت کے استبعاد کی ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ اتنی وسیع دنیا کے ایک ایک شخص کے ہر قول و فعل کا علم کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ سب کا حساب کرنے بیٹھے گا! ان کے اس مغالطہ کو دور کرنے کے لیے یہاں بھی اللہ تعالیٰ کے محیطِ کل علم کا حوالہ دیا جس طرح اوپر توحید کے سلسلہ میں دیا ہے۔

لِّیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِیْمٌ ○ وَالَّذِیْنَ سَعَوْ فِیْۤ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِیْمٌ (۴-۵)

قیامت کا آنا کیوں ضروری ہے

یہ قیامت کی ضرورت واضح فرمائی کہ اس کا آنا کیوں ضروری ہے۔ فرمایا کہ اس لیے ضروری ہے کہ وہ نہ آئے تو اس کے معنی یہ ہونے کہ خدا کے نزدیک نیک و بد دونوں یکساں ہیں حالانکہ یہ بات بالبداہت غلط ہے۔ یہ دنیا کوئی اندھیر نگری نہیں ہے اس وجہ سے لازمی ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں اللہ تعالیٰ ایمان و عمل صالح والوں کو ان کی نیکیوں کا صلہ اور جنھوں نے اللہ کی باتوں کو شکست دینے کی کوشش کی ان کو

ان کی اس سعیِ نامراد کی سزا دے۔

یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قیامت کا اصل مقصد اہلِ ایمان کو صلہ دینا بتایا گیا ہے۔ اس لیے کہ اس کا اصل مقصود درحقیقت ہے ہی یہی۔ مجرمین کو سزا دینا اس کے مقاصد میں سے نہیں بلکہ اس کے لوازم و نتائج میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا رحمت کے لیے بنائی ہے اور اس رحمت ہی کے لیے اس نے آخرت کا دن بھی رکھا ہے لیکن اس کا لازمی نتیجہ یہ بھی نکلے گا کہ جو لوگ اپنے آپ کو اس رحمت کا سزاوار نہیں بنائیں گے وہ اس کی نقمت کے سزاوار ٹھہریں گے۔

قیامت کا اصل مقصد اہلِ ایمان کو صلہ دینا ہے کفار کو سزا دینا اس کا لازمی نتیجہ ہے

اہلِ ایمان کے لیے دو چیزوں کا یہاں ذکر فرمایا ہے۔ ایک مغفرت، دوسری 'رزقِ کریم'۔ 'مغفرت' سے مراد یہ ہے کہ ایمان و عملِ صالح کی زندگی بسر کرتے ہوئے ان سے جو کوتاہیاں اور غلطیاں صادر ہوئی ہوں گی اللہ تعالیٰ ان سے درگزر فرمائے گا۔ 'رزقِ کریم' ان تمام افضال و عنایات کی ایک جامع تعبیر ہے جن کے وہ جنت میں وارث ٹھہریں گے۔

کفار کا ذکر یہاں 'الَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ' کی صفت کے ساتھ فرمایا ہے۔ 'معاجزۃ' کے معنی ایک دوسرے کو شکست دینے کے قصد سے باہم مسابقت کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن کی تگ و دو رات دن اللہ کی آیات اور اس کی باتوں کو شکست دینے کے لیے وقف رہی ہے ان کو اللہ تعالیٰ 'رجز الیم' کے عذاب میں سے حصہ دے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ اشارہ کفر کے سرغنوں کی طرف ہے جن کے لیے عذاب بھی مخصوص ہوگا۔ اسی مخصوص عذاب کو 'عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ' سے تعبیر فرمایا۔ 'رجز' اس عذاب کو کہتے ہیں جو نہایت ہولناک ہو۔

کفر کے سرغنوں کا انجام

وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ ۙ وَيَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ (۶)

یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جن کو علم حقیقی کی روشنی عطا ہوئی۔ عام اس سے کہ وہ ان اہلِ کتاب میں سے ہوں جنھوں نے اپنے نبیوں اور صحیفوں کے علم کو محفوظ رکھا یا ان سلیم الفطرت لوگوں میں سے ہوں جن کے قلوب ان کی سلامت روی کے باعث قرآن کی روشنی میں مستنیر ہوئے۔ فرمایا کہ یہ لوگ اس چیز کو بالکل حق سمجھتے ہیں جو تمھاری طرف اتاری گئی ہے۔ یعنی تم جس توحید کی دعوت دے رہے ہو اور جس قیامت سے لوگوں کو ڈرا رہے ہو، وہ اس کی تائید کر رہے ہیں کہ یہی حق ہے اور جو لوگ اپنے مزعومہ شرکا و شفعا کے بل پر بڑے طنطنہ کے ساتھ توحید اور قیامت کی تکذیب کر رہے ہیں وہ یکسر باطل پر ہیں۔ یہ بات یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے فرمائی گئی ہے کہ اگر یہ فکرے اور لاابالی لوگ تمھاری مخالفت کر رہے ہیں تو اس کی پروا نہ کرو، تمھارے اطمینان کے لیے یہ چیز بس کافی ہے کہ جن کے اندر علم و معرفت کی روشنی

عاقلوں کی تائید آدمی کے اطمینان کے لیے بس ہے

ل اہلِ عرب میں جو لوگ حنیفیت کے پیرو تھے وہ بھی اسی زمرے میں شامل ہیں۔

ہے وہ تمھارے مؤید ہیں۔ آدمی کو پروا عاقلوں کی ہونی چاہیے نہ کہ احمقوں اور لاخیروں کی۔

'وَیَھْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ' یعنی یہ اہل علم اس حقیقت کو برملا تسلیم کرتے ہیں کہ یہ کتاب لاریب خدائے عزیز و حمید کے راستہ کی طرف رہنمائی کرنے والی ہے۔ یعنی دوسروں نے جو دین گھڑ رکھے ہیں وہ تو تمام تر ضلالت اور ہلاکت کے کھڈ میں گرانے والے ہیں البتہ یہ کتاب خدا کی راہ دکھانے والی ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی دو صفتیں مذکور ہوئی ہیں ایک 'عَزِیْز' دوسری 'حَمِیْد'۔ 'عَزِیْز' سے اس کی عزت و قدرت کا اظہار ہو رہا ہے اور 'حمید' سے دنیا اور آخرت دونوں میں اسی کا سزاوار حمد ہونا اور یہ دونوں صفتیں توحید اور قیامت کو متلزم ہیں، جیسا کہ اوپر کے مباحث سے واضح ہو چکا ہے۔

قرآن کی اصطلاح میں حقیقی علم

اس آیت سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ حقیقی علم، قرآن کی اصطلاح میں، صرف خدا کی معرفت اور آخرت کا علم ہے۔ اگر یہ علم کسی کے اندر نہ ہو تو دوسرے کتنے ہی علوم وہ پڑھ ڈالے اس کا یہ سارا علم اس کے لیے بار اور دوسروں کے لیے خطرہ ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے 'علما' صرف انھی کو کہا ہے جن کو خدا اور آخرت کی معرفت حاصل ہو:

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا ۭ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ (فاطر: ۲۸)	اللہ سے اس کے بندوں میں سے بس وہی ڈرتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں اور بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا، بخشنے والا ہے۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ھَلْ نَدُلُّکُمْ عَلٰی رَجُلٍ یُّنَبِّئُکُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ کُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّکُمْ لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ (۷)

کفار کا رویہ آنحضرت صلعم کی مخالفت میں

اہل ایمان کی روش کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اب یہ ان لوگوں کی روش بیان ہو رہی ہے جو علم کی روشنی سے محروم، کفر کے اندھیرے میں بھٹک رہے ہیں۔ فرمایا کہ ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ تمھارا اور تمھاری دعوت کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ لوگوں سے کہتے ہیں کہ آؤ ہم تمھیں ایک ایسا سرپھرا دکھائیں جو خدا کا رسول بن کر یہ منادی کرتا پھر رہا ہے کہ لوگ مر کر جب بالکل ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو وہ از سر نو زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے! ——— گویا ان کے نزدیک یہ بات اس قابل بھی نہیں کہ اس کی تردید میں کوئی دلیل دی جائے۔

اَفْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَمْ بِہٖ جِنَّۃٌ ؕ بَلِ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ فِی الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِیْدِ (۸)

یہ ان کے اسی استہزا کی مزید تفصیل اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا برمحل جواب ہے۔

'اَفْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَمْ بِہٖ جِنَّۃٌ' یعنی وہ کہتے ہیں کہ اس شخص کا معاملہ دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو یہ مانا جائے کہ اس نے یہ خدا پر جھوٹ باندھا ہے کہ خدا نے اس کو رسول بنا کر بھیجا ہے اور وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس کی طرف سے کہہ رہا ہے یا پھر یہ مانا جائے کہ یہ بھی جنون کی ایک قسم ہے جس میں

یہ شخص مبتلا ہوگیا ہے! مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں بیک وقت اس شخص میں موجود ہیں۔ یہ مفتری بھی ہے اور مجنون بھی!

متمردین کے استہزا کا باوقار جواب

'بَلِ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ الاٰیۃ'۔ ان متمردین کے اس استہزاء کا جواب قرآن نے فوراً دیا اور دیکھیے کتنا باوقار اور موثر جواب دیا ہے۔

فرمایا کہ ان لال بجھکڑوں نے تشخیص بہت غلط کی۔ خرابی نہ داعی میں ہے نہ دعوت میں بلکہ ساری خرابی خود ان لوگوں کے اندر ہے جو آخرت پر ایمان نہیں لا رہے ہیں۔ وہ عذاب اور نہایت دور کی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ یعنی ایک گمراہی تو وہ ہوتی ہے جس سے پلٹ کر آنے اور اصلاح کا امکان باقی رہتا ہے، ہزار خرابی کے بعد بھی۔ لیکن جو آخرت کے عذاب میں مبتلا ہوا اس کی بازگشت کا پھر کوئی امکان باقی نہیں رہ جاتا۔ اس کے لیے امید کے تمام دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے اس انجام کو مستقبل کے صیغہ سے بیان کرنے کے بجائے حال کے اسلوب میں بیان فرمایا اس لیے کہ ان کا یہ انجام ان کے رویہ کے اندر ہی مضمر ہے۔ گویا آج ہی وہ اپنی رعونت کے سبب سے اس سے دوچار ہیں۔

اَفَلَمۡ یَرَوۡا اِلٰی مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ ؕ اِنۡ نَّشَاۡ نَخۡسِفۡ بِهِمُ الۡاَرۡضَ اَوۡ نُسۡقِطۡ عَلَیۡهِمۡ کِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّکُلِّ عَبۡدٍ مُّنِیۡبٍ (۹)

اس کائنات کی کسی چیز کا نفع رسانی بالاضطرار نہیں بلکہ خدا کے حکم سے ہے

اس مجموعۂ آیات کی پہلی آیت میں جو مضمون بیان ہوا ہے مجموعہ کے آخر میں اسی مضمون کا ایک نئے اسلوب سے اعادہ ہے۔ پہلی آیت میں فرمایا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب خدا ہی کا ہے اس وجہ سے دنیا میں بھی شکر کا حقیقی سزاوار وہی ہے اور آخرت میں بھی اسی کی حمد ہوگی۔ یہاں فرمایا کہ کیا ان متکبرین نے اس حقیقت پر کبھی غور نہیں کیا کہ یہ آسمان جو ان کے سروں پر شامیانے کی طرح تنا ہوا ہے اور یہ زمین جو ان کے قدموں کے نیچے فرش کی طرح بچھی ہوئی ہے اور جن کے فوائد و برکات سے یہ متمتع ہو رہے ہیں، یہ ان کے تھامے ہوئے نہیں تھمے ہیں بلکہ ان کو اللہ ہی نے تھام رکھا ہے۔ اگر اللہ نے ان کو نہ تھام رکھا ہوتا تو یہ دونوں ان کے لیے نعمتوں کے بجائے نقمتوں کا ذریعہ بن جاتے۔ فرمایا کہ ہم جب چاہیں ان کے سمیت زمین کو دھنسا دیں اور جب چاہیں اسی آسمان سے ابر رحمت برسانے کے بجائے ان پر پتھر برسا دیں۔ اس کائنات کی کوئی چیز بھی انسان کو بالاضطرار نفع نہیں پہنچا رہی ہے بلکہ خدا کے حکم سے پہنچا رہی ہے اور کوئی چیز بھی براہ راست انسان کے اختیار میں نہیں ہے بلکہ خدا کے حکم سے وہ اس کی نفع رسانی میں سرگرم ہے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے جو انسان پر واجب کرتی ہے کہ وہ کسی نعمت پر اترائے نہیں بلکہ اپنے اس رب کا شکرگزار رہے جس نے اس کو یہ نعمت بخشی ہے اور اس کو خدا کی نافرمانی اور اس سے بغاوت کا ذریعہ بنانے کے بجائے اس کو اسی کی خوشنودی اور فرمانبرداری میں استعمال کرے۔

یہی مضمون آگے والی سورہ ـــــ سورۂ فاطر ـــــ میں، جو اس کا مثنیٰ ہے، یوں

ارشاد ہوا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ	بے شک اللہ ہی آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے
الْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَلَئِنْ زَالَتَآ	کہ وہ لڑھک نہ جائیں اور اگر وہ دونوں لڑھک جائیں
اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ	تو کسی کی تاب نہیں کہ وہ خدا کے چھوڑ دینے کے بعد
بَعْدِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا	ان کو تھام سکے۔ بے شک وہ نہایت بردبار اور
غَفُوْرًا (فاطر: ۴۱)	بخشنے والا ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّکُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ ۔ یعنی آسمانوں اور زمین کے اس پہلو پر اگر غور کرتے تو اس کے اندر اس بات کی بہت بڑی دلیل موجود ہے جس کی قرآن ان کو دعوت دے رہا ہے لیکن اس دلیل تک رسائی کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر حقیقت کی طلب، عبرت پذیری کی صلاحیت اور متوجہ ہونے والا دل ہو۔ جن کے اندر یہ اوصاف نہ ہوں ان کے لیے کوئی نشانی بھی کارگر نہیں ہو سکتی۔

۲۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۱۰-۲۱

آگے تاریخ سے دو مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ پہلی مثال حضرات داؤد و سلیمان علیہما السلام کی ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے عظیم بادشاہی، عظیم علم و حکمت اور آسمان و زمین کی بے شمار نعمتوں سے نوازا اور وہ ان نعمتوں کو پاکر طغیان و فساد میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ برابر اپنے رب کے شکر گزار اور فرماں بردار رہے۔ ان کی اس شکر گزاری کا صلہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ دیا کہ ان کے لیے نعمتوں میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔

دوسری مثال اہلِ سبا کی ہے۔ ان کو بھی ایک نہایت آباد و زرخیز ملک کی حکومت ملی لیکن وہ اس کو پاکر طغیان و فساد میں مبتلا ہو گئے بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک سیلاب بھیج کر اس طرح ان کو تباہ کر دیا کہ وہ ایک داستانِ پارینہ بن کر رہ گئے۔

یہ دونوں مثالیں قریش کے مترفین و متکبرین کے سامنے پیش کی گئی ہیں کہ ان کے سامنے بھی یہ دونوں راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ وہ چاہیں تو حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرح خدا کے شکر گزار رہ کر اپنے آپ کو خدا کی نعمتوں کا حقدار بنا سکتے ہیں اور چاہیں تو اہلِ سبا کی روش اختیار کر کے اس کے قہر کو بھی دعوت دے سکتے ہیں۔ ساتھ ہی اس میں یہ تذکیر بھی ہے کہ جب اس دنیا میں خدا کے قانونِ مجازات کے ظہور کی یہ مثالیں موجود ہیں تو آخرت میں اس کے ظہور کو کیوں مستبعد خیال کرتے ہو! ——— اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۰-۲۱

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ؕ يٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ۝۱۰ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِی السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا

صَالِحًا ۖ إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١١﴾ وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ غُدُوُّهَا
شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۖ وَأَسَلْنَا لَهُ عَيْنَ الْقِطْرِ ۖ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ
يَعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۖ وَمَنْ يَزِغْ مِنْهُمْ عَنْ أَمْرِنَا نُذِقْهُ
مِنْ عَذَابِ السَّعِيرِ ﴿١٢﴾ يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِنْ مَحَارِيبَ
وَتَمَاثِيلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُورٍ رَاسِيَاتٍ ۚ اعْمَلُوا آلَ دَاوُودَ شُكْرًا ۚ
وَقَلِيلٌ مِنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ ﴿١٣﴾ فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا
دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنْسَأَتَهُ ۖ فَلَمَّا
خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَنْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ
الْمُهِينِ ﴿١٤﴾ لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ ۖ جَنَّتَانِ عَنْ
يَمِينٍ وَشِمَالٍ ۖ كُلُوا مِنْ رِزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ ۚ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ
وَرَبٌّ غَفُورٌ ﴿١٥﴾ فَأَعْرَضُوا فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنَاهُمْ
بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ أُكُلٍ خَمْطٍ وَأَثْلٍ وَشَيْءٍ مِنْ سِدْرٍ
قَلِيلٍ ﴿١٦﴾ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُمْ بِمَا كَفَرُوا ۖ وَهَلْ نُجَازِي إِلَّا الْكَفُورَ ﴿١٧﴾
وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا قُرًى ظَاهِرَةً
وَقَدَّرْنَا فِيهَا السَّيْرَ ۖ سِيرُوا فِيهَا لَيَالِيَ وَأَيَّامًا آمِنِينَ ﴿١٨﴾
فَقَالُوا رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا وَظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنَاهُمْ
أَحَادِيثَ وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِكُلِّ صَبَّارٍ
شَكُورٍ ﴿١٩﴾ وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ إِبْلِيسُ ظَنَّهُ فَاتَّبَعُوهُ إِلَّا فَرِيقًا
مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٢٠﴾ وَمَا كَانَ لَهُ عَلَيْهِمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلَّا لِنَعْلَمَ

مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِيْ شَكٍّ ؕ وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿۲۱﴾ ع ۱۲/۸

ترجمۂ آیات ۱۰ - ۲۱

اور ہم نے داؤد کو اپنے خاص فضل سے نوازا۔ اے پہاڑو، تم بھی اس کے ساتھ تسبیح میں شرکت کرو اور یہی حکم ہم نے پرندوں کو بھی دیا۔ اور ہم نے اس کے لیے لوہے کو نرم کر دیا کہ ڈھیلی ڈھالی زرہیں بناؤ اور ان کے جوڑ پیوستہ رکھو اور سب نیک عمل کرو، بے شک تم جو کچھ کرتے ہو میں اس کو اچھی طرح دیکھ رہا ہوں۔ ۱۰-۱۱

اور ہم نے سلیمان کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا۔ اس کا جانا بھی مہینہ بھر کا ہوتا اور آنا بھی مہینہ بھر کا ہوتا اور ہم نے اس کے لیے تانبے کا چشمہ بہا دیا اور جنات میں سے بھی اس کے لیے مسخر کر دیے جو اس کے رب کے حکم سے اس کے حضور خدمت کرتے (اور ان کے لیے ہمارا حکم یہ تھا کہ) جو ان میں سے ہمارے حکم سے سرتابی کرے گا تو ہم اس کو دوزخ کا عذاب چکھائیں گے۔ وہ اس کے لیے بناتے جو وہ چاہتا، محرابیں، مجسمے، حوضوں کے مانند لگن، اور لنگر انداز دیگیں —— اے آلِ داؤد، شکر گزاری کے ساتھ عمل کرو اور میرے بندوں میں شکر گزار تھوڑے ہی ہیں۔ ۱۲-۱۳

پس جب ہم نے اس پر موت کا فیصلہ نافذ کیا تو ان کو اس کی موت سے نہیں آگاہ کیا مگر زمین کے کیڑے نے جو اس کے عصا کو کھا تا تھا پس جب وہ گر پڑا تب جنوں پر واضح ہوا کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں نہ پڑے رہتے۔ ۱۴

اور اہلِ سبا کے لیے بھی ان کے مسکن میں بہت بڑی نشانی موجود تھی۔ دہنے بائیں دونوں جانب باغوں کی دو قطاریں۔ اپنے رب کے بخشے ہوئے رزق سے متمتع ہو اور اس کے شکر گزار رہو! زمین شاداب و زرخیز اور پروردگار بخشنے والا ہے!! تو انھوں نے سرتابی

کی تو ہم نے ان پر بند کا سیلاب بھیج دیا اور ان کے باغوں کو دو ایسے باغوں سے بدل دیا جن میں بدمزہ پھل والے درخت اور جھاؤ اور بیری کی کچھ جھاڑیاں رہ گئیں۔ یہ ہم نے ان کی ناشکری کا بدلہ دیا اور ہم برا بدلہ ناسپاسوں ہی کو دیا کرتے ہیں! ۱۵ - ۱۷

اور ہم نے ان کے درمیان اور ان بستیوں کے درمیان، جن میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں ہمراہ بستیاں بھی آباد کیں اور ان کے درمیان سفر کی منزلیں ٹھہرا دیں۔ ان میں رات دن بے خوف و خطر سفر کرو۔ پس انھوں نے کہا، اے رب ہمارے سفروں میں دوری پیدا کر دے اور انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے تو ہم نے ان کو افسانۂ پارینہ بنا دیا اور ان کو بالکل تتر بتر کر چھوڑا۔ بے شک اس کے اندر نشانیاں ہیں ہر صبر کرنے والے، شکر کرنے والے کے لیے۔ ۱۸-۱۹

اور ابلیس نے ان کے اوپر اپنا گمان سچ کر دکھایا۔ سو انھوں نے اس کی پیروی کی۔ صرف اہلِ ایمان کا ایک گروہ اس سے بچ سکا۔ اور اس کو ان کے اوپر کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔ بس یہ کہ ہم ممیز کر دیں ان لوگوں کو جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں ان لوگوں سے جو اس کی بابت شک میں ہیں اور تمھارا رب ہر چیز کا نگران ہے۔ ۲۰ - ۲۱

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ۭ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ (۱۰)

حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ پر اللہ تعالیٰ نے جو فضلِ خاص فرمایا اس کی تفصیل سورۂ انبیاء اور سورۂ نمل میں گزر چکی ہے۔ یہاں ہم اپنی بحث صرف ضروری حد تک محدود رکھیں گے۔

حضرت داؤدؑ کا سوز و گداز

يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ۔ یہ اشارہ ہے اس سوز و گداز کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کو عطا فرمایا تھا کہ جب وہ پہاڑوں کے دامن میں بیٹھ کر اپنے خاص لاہوتی لحن میں اپنے رب کی حمد کا ترانہ چھیڑتے اور اپنی منظوم مناجاتیں پڑھتے تو شجر و حجر اور چرند پرند سب جھوم اٹھتے اور ان کی ہم نوائی کرتے۔

پہاڑوں اور پرندوں کی طرف سے ہم نوائی

'تَاْوِیْبٌ' کے اصل معنی 'ترجیع' کے ہیں یعنی کسی کے سُر میں اپنا سُر ملانا، اس کی آواز کو دہرانا، اس کی ہم آہنگی اور ہم نوائی کرنا۔ یوں تو اس کائنات کی ہر چیز خدا کی تسبیح کرتی ہے اور جب وہ تسبیح کرتی ہے تو لازماً تسبیح کرنے والوں کی ہم نوائی بھی کرتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے جس طرح حضرت داؤد کو خاص نوع کا لحنِ خاص اور خاص قسم کا لحن عطا فرمایا تھا اسی طرح اپنے خاص حکم سے پہاڑوں اور پرندوں کو یہ حکم بھی دیا تھا کہ جس وقت حضرت داؤد اپنے رب کی حمد و تسبیح کریں، وہ بھی ان کے ساتھ اس میں شریک ہوں۔ سورۂ انبیاء میں یہی مضمون یوں ادا ہوا ہے: 'وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ وَالطَّیْرَ (۷۹)' (اور ہم نے داؤد کے ساتھ پہاڑوں کو مسخر کر دیا اور پرندوں کو بھی)۔

نرم کے بعد ان کی زرہ کا حال

'وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِیْدَ': ان کی بزم کا حال بیان کرنے کے بعد یہ ان کی رزم کا حال بیان ہو رہا ہے کہ ہم نے اس کے لیے لوہے کو نرم کر دیا۔ اس کی وضاحت سورۂ انبیاء میں ہو چکی ہے کہ انھوں نے لوہے کو پگھلانے اور اس سے نہایت باریک کڑیوں کی زرہیں بنانے کے فن کو اتنی ترقی دی کہ لوہے کی زرہیں ایسی ڈھیلی ڈھالی بننے لگیں کہ معلوم ہوتا کہ کسی کپڑے سے بنائی گئی ہیں جن کا پہننا نہایت آسان ہوتا اور حفاظت کے پہلو سے وہ لوہے کا کام دیتیں۔

اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِی السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (۱۱)

لوہے کی صنعت میں اولیت کا امتیاز

'سٰبِغٰتٍ' ڈھیلے ڈھالے لباس کو کہتے ہیں جو پورے جسم کو ڈھانک لے۔ یہاں یہ ڈھیلی ڈھالی زرہوں کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ 'قَدِّرْ فِی السَّرْدِ' میں 'سَرْد' کے معنی بناوٹ کے اور 'تَقْدِیْر' کے معنی بناوٹ میں پورے تناسب کو ملحوظ رکھنے کے ہیں۔

لوہے سے ایسا لباس تیار کر لینا جو ڈھیلا ڈھالا بھی ہو اور اس کی کڑیوں میں پورا تناسب بھی ملحوظ رہ سکے بغیر اس کے ممکن نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد پر لوہے کے پگھلانے کی ایسی اعلیٰ سائنس کا انکشاف فرمایا، جس کی اوّلیت کا سہرا انہی کے سر ہے۔ اپنی اس ایجاد سے انھوں نے دفاعی اسلحہ میں ایک نہایت بیش قیمت اضافہ کیا جس سے ان کی فوجی قوت ان کے حریفوں کے مقابل میں بہت بڑھ گئی۔

اس فن کا اخلاقی تقاضا

'وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ': اوپر کے ٹکڑے میں اس فن کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے حوصلہ افزائی فرمائی گئی ہے۔ اس ٹکڑے میں اس فن کا اخلاقی تقاضا بیان ہوا ہے کہ اس کو پاکر بہک نہ جانا اور اس کو زمین میں فساد کا ذریعہ نہ بنانا بلکہ اس بات کو برابر یاد رکھنا کہ جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ یہ ہدایت اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد اور ان کے تمام آلِ داؤد اتباع کو فرمائی۔ اس کا ذکر بار بار زبور اور امثال میں بھی آیا ہے۔

اس زمانے میں انسان نے سائنس میں جو ترقی کی ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے بڑے بڑے فائدے پہنچے ہیں اور پہنچ سکتے ہیں، لیکن دو باتیں

انسان بھول گیا ہے۔ ایک یہ کہ سائنس کا ہر انکشاف، جو ہوا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رہنمائی سے ہوا ہے۔ دوسری یہ کہ ہر نعمت اور ہر قوت کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ انسان اس کو خدا کی امانت سمجھے اور یہ یاد رکھتا ہوا اس کو استعمال کرے کہ جس خدا نے یہ بخشی ہے وہ دیکھ رہا ہے کہ میں اس کو کہاں استعمال کرتا ہوں۔ ان دو حقیقتوں کے فراموش کر دینے کی وجہ سے اب سائنس انسان کے لیے ایک عظیم خطرہ بن گئی ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ انسان اپنے ہی ایجاد کیے ہوئے اسلحہ سے کب خودکشی کر لے۔

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ۭ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۭ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ (۱۲)

حضرت سلیمانؑ کی بحری قوت

حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح لوہے کے استعمال کا نہایت اعلیٰ فن تعلیم فرمایا جس سے انھوں نے اپنی بری قوت میں بے مثال اضافہ فرمایا اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کو ہوا کے کنٹرول کرنے کا فن عطا فرمایا جس سے انھوں نے اپنے بحری بیڑے کو اس قدر ترقی دی کہ ان کے جہازات مہینوں کا سفر بے روک ٹوک جاری رکھتے۔ سورۂ انبیاء کی آیت ۸۱ کے تحت ہم ذکر کر آئے ہیں کہ ان کے بادبانی جہازات نہایت دور دور کے سواحل تک سفر کرتے اور ان کے بادبان ایسے سائنٹیفک طریقہ پر بنائے گئے تھے کہ ہوا کی قلت یا شدت یا مخالفت سے ان کے سفر میں کوئی خلل واقع نہ ہوتا۔ سورۂ صٓ میں ہے: فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَاۗءً حَيْثُ اَصَابَ (۳۶) (پس ہم نے ہوا کو اس کی خدمت میں لگا دیا تھا وہ نہایت سازگاری کے ساتھ اس کے حکم سے چلتی جہاں وہ پہنچتا) سورۂ انبیاء میں ہے: وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا (۸۱) (اور ہم نے سلیمان کے لیے بادِ تند کو بھی مسخر کر دیا تھا جو چلتی تھی اس کے حکم سے اس سرزمین کی طرف جس میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں)۔

آیت زیر بحث میں انہی جہازوں کے طولِ سفر کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ ان کی ایک ایک ٹرپ مہینہ مہینہ بھر کی طویل مدت پر مستند ہوتی۔ ذکر اگرچہ ہوا کا ہے لیکن مقصود جہازوں ہی کا جانا اور آنا ہے۔ گویا اصل عامل کا ذکر کر کے معمول کی طرف اشارہ فرمایا ہے اس لیے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا اصل تصرف ہواؤں ہی میں ظاہر ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ لمبے لمبے سفر اسی صورت میں ممکن تھے جب یہ جہازات نہایت بڑے بڑے بھی ہوں اور ان کے ساتھ ہوا کے کنٹرول کرنے کا نظام اتنا اعلیٰ اور مستحکم ہو کہ وہ ہر قسم کے سمندروں کے اندر ہر نوع کی ہواؤں کا نہایت خوبی کے ساتھ مقابلہ کر سکیں۔ یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ فصیح عربی میں 'غدو' اور 'رواح' کے الفاظ صبح اور شام کی قید سے مجرد ہو کر صرف جانے اور آنے کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ (آل عمران: ۱۲۱) (اور جب کہ تم نکلے اپنے گھر سے مسلمانوں کو جنگ کے مورچوں میں مامور کرنے) اسی طرح لفظ 'رواح' پر صاحبِ اقرب الموارد نے لکھا ہے کہ 'وقد یستعمل لمطلق المضی والذھاب' (یہ لفظ مطلق آنے اور جانے کے مفہوم میں بھی

استعمال ہوتا ہے)۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ ہوا کی تسخیر سے مراد مجرد ہوا کی تسخیر نہیں بلکہ جس طرح اوپر حضرت داؤدؑ کے لیے لوہے کو نرم کرنے سے مقصود ان کی اسلحہ سازی اور جنگی قوت کی طرف اشارہ ہے، چنانچہ دوسرے مقام میں اس کی وضاحت بھی فرما دی ہے: "وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ (الانبیاء: ۸۰)" (اور ہم نے اس کو ایسے لباسوں کی صنعت سکھائی جو تمھاری جنگوں میں تمھیں محفوظ رکھے)، اسی طرح حضرت سلیمان کے لیے ہوا کی تسخیر سے مقصود ان کے بحری بیڑے کی قوت و شوکت کی طرف اشارہ مقصود ہے اور ان کے بحری بیڑے کی وسعت کا جو حال تھا اس کی طرف ہم سورۂ انبیاء کی تفسیر میں اشارہ کر چکے ہیں۔

تانبے کی صنعت

"وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ"۔ 'قطر' تانبے کو کہتے ہیں۔ تانبے کو تمدنی ترقی میں جو دخل حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ اس عہد کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں تانبے کی بھی بہت بڑی مقدار برآمد ہوئی اور اس کو انھوں نے اپنی تمدنی و تعمیری ترقیوں میں نہایت خوبی کے ساتھ استعمال کیا۔ آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تانبا سیال شکل میں برآمد ہوتا اور پھر منجمد ہو کر مختلف ضرورتوں میں استعمال ہوتا۔ آگے بڑی بڑی دیگوں اور لگنوں کا ذکر آ رہا ہے، ظاہر ہے کہ وہ اسی کی بنتی تھیں۔ ہیکل کی تعمیر میں بھی، جیسا کہ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس دھات کا بہت استعمال کیا۔ آج عربوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے تیل کے چشمے جاری کر دیے ہیں، حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے اس نے تانبے کا چشمہ جاری کر دیا تھا۔ زمین کے جتنے خزانے بھی ماضی میں دریافت ہوئے یا آج دریافت ہو رہے ہیں یا مستقبل میں دریافت ہوں گے وہ سب اللہ ہی کی بخشی ہوئی رہنمائی سے دریافت ہوئے اور ہوں گے۔ جن کی نگاہیں حقیقت بین ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہر چیز کا منبع اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن جن کی نگاہوں کو سائنس نے خیرہ کر رکھا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ ان کی اپنی کارستانی ہے۔

تسخیر جنات کا علم

"وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ"۔ سورۂ نمل کی تفسیر میں ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا علم بھی عطا فرمایا تھا جس کے ذریعے سے وہ شریر جنوں کو قابو میں کر کے ان کو اپنے مختلف کاموں میں استعمال کرتے تھے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جن براہ راست حضرت سلیمان علیہ السلام کے تصرف میں نہیں ہوتے تھے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہ ان کی اطاعت کرتے تھے۔ اور اگر ان سے کوئی عدول حکمی صادر ہوتی تو اللہ تعالیٰ ہی ان کو سزا دیتا تھا۔ "وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ" (ان میں سے جو ہمارے حکم کی سرتابی کرے گا تو ہم اس کو آگ کا عذاب چکھائیں گے)۔ بعض لوگوں نے جنوں سے دیو ہیکل اور طاقتور آدمی مراد لیے ہیں لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ سورۂ نمل میں صاف تصریح ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا لشکر جنوں، انسانوں اور پرندوں سب پر مشتمل تھا: "وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ" (اور سلیمان کے ملاحظہ کے لیے اس کا لشکر — جنوں، انسانوں

اور پرندوں پر مشتمل ـــ اکٹھا کیا گیا) اگر جن سے مراد انسان ہی ہوتے تو یہاں جنوں کے الگ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

یَعۡمَلُوۡنَ لَهٗ مَا یَشَآءُ مِنۡ مَّحَارِیۡبَ وَ تَمَاثِیۡلَ وَ جِفَانٍ کَالۡجَوَابِ وَ قُدُوۡرٍ رّٰسِیٰتٍ ؕ اِعۡمَلُوۡۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُکۡرًا ؕ وَ قَلِیۡلٌ مِّنۡ عِبَادِیَ الشَّکُوۡرُ (۱۳)

حضرت سلیمانؑ نے جنات سے تعمیری کام لیے

یہ ان کاموں کی تفصیل ہے جن میں حضرت سلیمانؑ ان مسخر جنوں کو استعمال کرتے تھے۔ یہ سارے کام تعمیری، تمدنی اور اصلاحی ہیں۔ یہود اپنے دورِ زوال میں جب علوم سفلیہ میں مبتلا ہوئے تو ان خرافات کو انھوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کیا۔ یہاں قرآن نے واضح فرمایا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے جنات کو جس علم سے مسخر کیا وہ اللہ تعالیٰ نے خاص اپنے فضل سے ان کو بخشا تھا، اس کو سفلی علوم سے کوئی تعلق نہیں تھا اور جنات سے جو کام انھوں نے لیے وہ سب تعمیری اور تمدنی کام تھے۔ ان کو انھوں نے فاسد اغراض کے لیے استعمال نہیں کیا۔ اس مضمون کی تفصیل سورۂ بقرہ میں آیت 'وَمَا كَفَرَ سُلَیۡمٰنُ ...الآیۃ' کے تحت گزر چکی ہے۔

'محاریب' 'اور تماثیل'

مِنۡ مَّحَارِیۡبَ وَ تَمَاثِیۡلَ: یعنی ان جنوں سے حضرت سلیمان علیہ السلام محرابیں اور مجسمے بھی بنواتے تھے۔ 'محراب' میرے نزدیک اپنے معروف معنی ہی میں یہاں استعمال ہوا ہے اس کے خاص طور پر ذکر کی وجہ یہ ہے کہ کسی عمارت کا سب سے زیادہ نمایاں حصہ اس کی محرابیں ہی ہوتی ہیں جو دیکھنے والوں کو سب سے پہلے نظر آتی ہیں۔ اس وجہ سے تعمیری آرٹ کا سب سے زیادہ مظاہرہ انہی پر ہوتا ہے۔ حضرت سلیمانؑ کی تعمیر کرائی ہوئی عمارتوں میں سے ہیکل اور ان کے محل کی تعمیر کی تفصیل کتاب سلاطین میں موجود ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی محرابوں پر تعمیری آرٹ کا پورا کمال صرف کیا گیا تھا۔ ان پر نہایت خوبصورت پھولوں کے نقش ابھارے گئے تھے۔

'تَمَاثِیۡل'، 'تِمۡثَال' کی جمع ہے۔ 'تمثال' کسی چیز کی مصوّر یا کندہ کی ہوئی صورت، شبیہ یا اس کے پیکر اور مجسمہ کو کہتے ہیں۔ یہ صورت بے جان چیزوں کی بھی ہو سکتی ہے' مثلاً کسی دریا، پہاڑ، درخت، جھاڑی پھول وغیرہ کی اور حقیقی یا فرضی جاندار چیزوں کی بھی ہو سکتی ہے' مثلاً انسان، فرشتے، جنات اور حیوانات وغیرہ کی ـــ تورات کی کتاب سلاطین سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ان دونوں ہی قسموں کی تماثیل بنوائیں۔ مثلاً ان کے محل کے ذکر کے سلسلہ میں ہے:

"اور ان حاشیوں پر جو پٹڑوں کے درمیان تھے شیر اور بیل اور کروبی بنے تھے" سلاطین ۱: ب - ۲۹

اسی طرح ہیکل کی تعمیر کے بیان میں ہے۔

"اور الہام گاہ میں اس نے زیتون کی لکڑی کے دو کروبی دس دس ہاتھ اونچے بنائے اور کروبی کا ایک بازو پانچ ہاتھ کا اور دوسرا بازو بھی پانچ ہی ہاتھ کا تھا"

"اور اس گھر کے اندر دیوار پر تھا جس پر لٹو اور کھلے ہوئے پھول کندہ کیے گئے تھے۔" سلاطین : باب۔ ۱۸

"اس گھر کی سب دیواروں پر گرداگرد، اندر اور باہر کروبیوں اور کھجور کے درختوں اور کھلے ہوئے پھولوں کی صورتیں کندہ کیں۔" سلاطین : بٹ ۔ ۳۰

ایک اشکال کا جواب

جہاں تک بے جان چیزوں کی صورتوں اور مورتوں کا تعلق ہے ان کے جواز میں تو کوئی اختلاف رائے نہیں ہے، لیکن جاندار چیزوں، بالخصوص فرشتوں کی مورتوں کا معاملہ سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو کس طرح جائز سمجھا۔ اگر اس کا جواب یہ دیا جائے، جیسا کہ عام طور پر ہمارے مفسرین نے دیا ہے، کہ بنی اسرائیل کی شریعت میں یہ چیزیں حرام نہیں تھیں تو یہ جواب تورات سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ تورات میں ان چیزوں کی حرمت نہایت واضح الفاظ میں وارد ہوئی ہے۔ خروج ۔ ۲۰ : ۲ - ۵ میں ہے :-

"خداوند تیرا خدا جو تجھے زمین مصر سے، غلامی کے گھر سے، نکال لایا، میں ہوں۔ میرے حضور تیرے لیے دوسرا خدا نہ ہووے۔ تو اپنے لیے کوئی مورت یا کسی چیز کی صورت، جو اوپر آسمان پر یا نیچے زمین پر یا پانی میں زمین کے نیچے سے، مت بنا۔ تو ان کے آگے اپنے تئیں مت جھکا اور نہ ان کی عبادت کر کیونکہ میں تیرا خدا غیور خدا ہوں۔"

دیکھیے اس میں نہایت واضح الفاظ میں صورت یا مورت بنانے کی ممانعت ہے۔ اس وجہ سے یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ پچھلی شریعتوں میں یہ چیزیں جائز تھیں، صرف اسلام میں یہ حرام قرار دی گئی ہیں۔ یہ چیزیں پہلے بھی ناجائز تھیں اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے تورات کے کسی حکم کی خلاف ورزی کی۔ اس وجہ سے ہمارا خیال یہ ہے کہ انھوں نے اسی قسم کی تماثیل بنوائی ہوں گی جن کا تعلق مجرد آرٹ سے ہے اور مذہبی تقدس کا جن کے اندر کوئی شائبہ نہیں تھا۔ لیکن جب یہود میں مورت پرستی کا رواج ہوا ہوگا تو اس قسم کی چیزیں ان کے بادشاہوں نے بنوائی ہوں گی اور ان کو سند جواز دینے کے لیے ان کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا گیا ہوگا۔ آخر تمام علوم سفلیہ بھی تو حضرت سلیمان علیہ السلام ہی کی طرف یہود نے منسوب کیے جس کی تردید سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ اسی طرح کی خرافات ان کی طرف کتاب سلاطین میں بھی منسوب کر دی گئی ہیں۔ یہ امر واضح رہے کہ یہود نے حضرت سلیمانؑ کو ایک پیغمبر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک بالکل دنیا دار بادشاہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور ان کی سیرت ہر پہلو سے انھوں نے داغدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

حضرت سلیمانؑ کا جود و کرم

'وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ'۔ 'جفان' 'جفنۃ' کی جمع ہے جس کے معنی تھال اور لگن کے ہیں اور 'جوابی' 'جابیۃ' کی جس کے معنی حوض کے ہیں۔ 'راسیات' پہاڑوں کی صفت کے لیے آتا ہے۔ یہاں یہ ان بڑی بڑی دیگوں کے لیے آیا ہے جو اتنی بھاری بھرکم ہوتیں کہ آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہیں کی جا سکتی تھیں۔ وہ ایک ہی جگہ چولھوں پر نصب رہتیں اور بیک وقت منوں کے حساب سے

ان میں کھانا پکتا۔

اوپر کے ٹکڑے میں سلیمانی تمدن کے آرٹ کے پہلو کو نمایاں کیا گیا تھا۔ اس ٹکڑے میں ان کے جود و کرم کو نمایاں کیا گیا ہے کہ جنات حضرت سلیمانؑ کے لیے بڑے بڑے لگن بناتے جو حوضوں کے مانند ہوتے اور بھاری بھرکم دیگیں بناتے جو ایک ہی جگہ لنگر انداز رہتی تھیں۔ یہ حوضوں کے مانند لگن اور بھاری بھرکم دیگوں کا ذکر حضرت سلیمانؑ کے جود و کرم کی تعبیر کے لیے ہے۔ اگر آپ کو یہ کہنا ہو کہ فلاں شخص بڑا فیاض ہے، اس کے خوانِ کرم سے ایک خلقِ عظیم کی پرورش ہو رہی ہے تو فصیح عربی میں اس کی تعبیر کے لیے یہ دو حرف کافی ہوں گے کہ لَہٗ قُدُوْرٌ رَّاسِیٰتٌ۔ عرب شعرائے حاتم اور اپنے دوسرے فیاضوں کے لیے یہی استعارہ استعمال کیا ہے۔

رحمانی تمدن اور شیطانی تمدن

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت سلیمانؑ کے ہاتھوں جو تمدن وجود میں آیا اس میں صرف سائنس، آرٹ اور شوکت کی نمائش ہی نہیں تھی بلکہ اس کے پہلو بہ پہلو اس میں غربا پروری کا نہایت وسیع اور فیاضانہ اہتمام بھی تھا۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس تمدن کی تحسین فرمائی۔ جس تمدن میں یہ دونوں پہلو، پورے توازن کے ساتھ موجود ہوں وہ مبارک تمدن ہے۔ اس کے برعکس جس تمدن میں آرٹ اور طمطراق کی نمائش تو ہو لیکن غربا فاقے کریں وہ تمدن شیطانی ہے۔

نعمت کا حق خدا کی شکرگزاری ہے

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا۔ یہ اس فضل و انعام کا حق بیان ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ پر فرمایا۔ ان کو ہدایت ہوئی کہ اس علم و سائنس اور ان ارضی و سماوی برکات کو پاکر بہک نہ جانا بلکہ اپنے رب کی شکرگزاری کے ساتھ ہر چیز اس کے صحیح محل میں برتنا اور ہر قدم صحیح سمت میں اٹھانا۔ یہ نصیحت یوں تو اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت زبانِ حال سے بھی کرتی ہے لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام پیغمبر تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے بھی ان کو اس کی ہدایت فرمائی۔ اس کا ذکر زبور اور امثال دونوں میں بار بار آتا ہے۔ یہاں 'اٰلَ دَاوٗدَ' سے خطاب کے اندر حضرت سلیمان علیہ السلام، ان کے آل و اولاد اور ان کے تمام اتباع کے لیے یہ یاددہانی ہے کہ خدا کی شکرگزاری میں اپنے باپ کے نقشِ قدم کی پیروی کرنا اس لیے کہ یہ تمام عظمت و حشمت تم نے انہی سے وراثت میں پائی ہے اور ان کو اللہ نے یہ سب کچھ ان کی شکرگزاری کے صلہ میں عطا فرمایا تھا۔

ایک نہایت اہم تنبیہ

وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ۔ یہ ایک مزید تنبیہ اور نہایت اہم تنبیہ ہے کہ شکر کی راہ کوئی آسان راہ نہیں ہے بلکہ نہایت کٹھن راہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی نعمتیں بخشتا بہتوں کو ہے لیکن ان کو پاکر ان کا حق ادا کرنے والے بہت تھوڑے نکلتے ہیں۔ زیادہ ایسے ہی نکلتے ہیں جو خدا کے باغی و نافرمان بن جاتے ہیں۔ اس سے حکمتِ دین کا یہ نکتہ واضح ہوا کہ صبر اور شکر میں سے زیادہ مشکل امتحان شکر کا امتحان ہے۔ حضرت مسیحؑ کے ارشادات سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ انھوں نے اسی حقیقت کو یوں واضح فرمایا

کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں داخل ہونا آسان ہے پر دولت مند خدا کی بادشاہی میں نہیں داخل ہو سکتا۔'

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنسَأَتَهُ ۖ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَن لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ (۱۴)

جنات کے پاس علم غیب کا کوئی ذریعہ نہیں ہے

اوپر کی آیات سے ان لوگوں کی پوری پوری تردید ہو گئی جو اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ حضرت سلیمانؑ کی ساری کارفرمائیاں نعوذ باللہ جنات کی رہین احسان تھیں۔ اب آخر میں یہ اشارہ بھی فرما دیا کہ جنات کے پاس غیب کے جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ وہ اس سے اسی طرح بے خبر ہیں جس طرح دوسری مخلوقات بے خبر ہیں۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے حضرت سلیمانؑ کی وفات کے واقعہ کا حوالہ دیا ہے کہ جس وقت حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات ہوئی وہ اپنے مسخر جنوں کے کام کی نگرانی کر رہے تھے لیکن جنات کو ان کی موت کی خبر نہیں ہوئی۔ وہ بدستور اپنی بیگار میں جتے رہے۔ بالآخر ایک طویل وقفہ کے بعد ان کو پتہ چل سکا کہ حضرت سلیمانؑ کی وفات ہو چکی ہے تب وہ ان کی غلامی سے رہائی حاصل کر سکے۔

واقعہ کی صورت

واقعہ کی صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت سلیمانؑ اپنے اہم کاموں کی نگرانی، خصوصاً جو جنات کے ہاتھوں انجام پاتے، بنفس نفیس فرماتے۔ چنانچہ وہ اپنی عصا کی ٹیک لگائے ہوئے کسی تعمیری کام کی نگرانی کر رہے تھے کہ اسی اثنا میں ان کی موت کا وقت آگیا اور فرشتۂ اجل نے ان کی روح قبض کر لی لیکن وہ جس طرح عصا کے سہارے کھڑے تھے اسی طرح بدستور قائم رہے اور جنات اس ڈر سے اپنے کام میں لگے رہے کہ حضرت سلیمانؑ موجود ہیں۔ بالآخر ان پر ایک عرصہ گزر گیا اور اس اثنا میں دیمک نے عصا کو نیچے سے کھا لیا، جس کے بعد ان کا جسد مبارک زمین پر گرا۔ تب جنات کو یہ احساس ہوا کہ اگر ان کو غیب کا علم ہوتا تو وہ اتنی دیر تک اس بیگار کی ذلت میں گرفتار نہ رہتے۔

'دَآبَّةُ الْاَرْضِ'

'دَآبَّةُ الْاَرْضِ' کا ذکر یہاں جن قرائن کے ساتھ ہوا ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد دیمک ہے۔ 'مِنْسَاۃ' عصا کو کہتے ہیں۔ یہ تصریح تو یہاں نہیں ہے کہ حضرت سلیمانؑ اس حالت میں کتنی دیر کھڑے رہے لیکن نہ اس طرح جسم کا قائم رہنا ذرا مستبعد ہے اور نہ دیمک کا اس طرح عصا کو کھا جانا ذرا مستبعد ہے۔ دیمک بڑی ظالم چیز ہے۔ اگر یہ کسی چیز کو لگ جائے تو بہت جلد اس کو ختم کر کے رکھ دیتی ہے، عصا تو ایک معمولی چیز ہے بالخصوص ایسی جگہوں میں جہاں یہ زیادہ ہو۔ پھر یہاں تو معاملے کی نوعیت بھی بالکل مختلف ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ حضرت سلیمانؑ کی موت اس طرح واقع ہو کہ لوگوں پر یہ واضح ہو جائے کہ حضرت سلیمانؑ جو ہوا اور جنات پر تصرف رکھتے تھے، وہ بھی اپنے تئیں مرگ ناگہانی سے نہ بچا سکے اور جنات کے دماغ سے بھی یہ خبط نکل جائے کہ وہ غیب جانتے یا جان سکتے ہیں۔ ان حقائق کو واضح کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت کو یہ شکل دی اور اللہ تعالیٰ جس کام کو کرنا چاہے وہ اس کو جس طرح چاہے کر سکتا ہے۔

تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ الاٰيۃ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اشرار جن، غیب کی ٹوہ میں ہمیشہ رہے ہیں اور اس مقصد کے لیے وہ آسمانوں میں بھی، جیسا کہ سورۂ جن اور قرآن کے دوسرے مقامات سے واضح ہے، استراقِ سمع کے لیے بیٹھتے رہے ہیں۔ اور اپنے دامِ فریب میں آئے ہوئے انسانوں پر انھوں نے یہ دعویٰ بھی جما رکھی تھی کہ ان کے پاس غیب کے اسرار سے واقف ہونے کے ذرائع موجود ہیں لیکن اس واقعہ نے ان کی آنکھیں کھول دیں اور ان پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ آسمان تو بہت دور ہے، انھیں تو اپنے سر پر کے اتنے بڑے واقعہ کی بھی خبر نہ ہو سکی جس کے باعث انھیں غلامی کے رسوا کن عذاب میں کچھ عرصہ مزید گرفتار رہنا پڑا۔

جنات پر کشفِ حقیقت

اس ٹکڑے سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنی بیگار میں صرف شریر جنوں کو لگایا تھا اور ان کے علمِ تسخیر کا تعلق صرف انہی سے تھا۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ ۬ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۭ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ (۱۵)

'سبا' کا ذکر سورۂ نمل کی آیت ۲۲ کے تحت گزر چکا ہے۔ جو علاقہ اب یمن کہلاتا ہے وہی پہلے سبا کا علاقہ تھا۔ یہ نہایت زرخیز و شاداب خطہ تھا۔ اس کی اصل شاہراہ کے دونوں جانب نہایت شاداب باغوں کا سلسلہ تھا جو پورے علاقہ پر پھیلا ہوا تھا لیکن اس کے باشندوں نے اللہ تعالیٰ کے اس فضل کی قدر نہیں کی، جس کی پاداش میں اللہ نے ان پر ایک سیلاب بھیجا جس سے پورا ملک تباہ ہو کر رہ گیا۔ اوپر حضرت داؤد و حضرت سلیمان علیہما السلام کا کردار شکرگزار بندوں کے کردار کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ اب یہ ناشکروں کا کردار اور ان کا انجام پیش کیا جا رہا ہے۔ سورۂ نحل کی آیات ۱۱۲-۱۱۳ میں بھی ان کی مثال سے قریش کو عبرت دلائی گئی ہے۔

ناشکروں کا کردار اور ان کا انجام

'لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ'۔ 'سَبَا' سے مراد یہاں اہلِ سبا ہیں۔ اور 'مسکن' یہاں خطہ اور علاقہ کے مفہوم میں ہے۔ لفظ 'اٰيَة' کی تنکیر تفخیمِ شان کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہلِ سبا کے لیے ان کے علاقے میں خدا کی رحمت و ربوبیت اور اس کے فضل و انعام کی بہت بڑی نشانی موجود تھی لیکن انھوں نے اس کی قدر نہیں کی۔ اس سے ان کو جو سبق حاصل کرنا تھا وہ سبق انھوں نے حاصل نہیں کیا۔

سبا اور اہلِ سبا

'جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ'۔ یہ اس نشانی کی وضاحت ہے کہ ان کے دونوں جانب، دہنے اور بائیں باغوں کی دو قطاریں تھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علاقہ کے وسط سے ان کی مرکزی شاہراہ گزرتی تھی اور اس شاہراہ کے دونوں جانب باغوں کی قطاریں تھیں۔ 'جَنَّتٰن' یہاں دو باغوں کے مفہوم میں نہیں بلکہ باغوں کی دو قطاروں کے مفہوم میں ہے۔ مثنیٰ کے اس طریقِ استعمال کی مثالیں عربی میں موجود ہیں اور یہاں اس کا قرینہ واضح ہے۔

'كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ'۔ خدا کی اس عظیم نشانی سے جو درس حاصل ہوتا ہے

اور جو اہلِ سبا کو حاصل کرنا تھا یہ اس کا بیان ہے کہ یہ عظیم رحمت و رفاہیت اپنی زبانِ حال سے ان کو درس دے رہی ہے کہ اپنے رب کے اس عظیم خوانِ کرم سے بہرہ مند ہوں اور اس کے شکر گزار رہیں۔

نعمت کا حق منعم کی شکرگزاری ہے

'بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ' 'طَيِّبَة' یہاں زرخیز و شاداب کے معنی میں ہے۔ اس معنی میں یہ لفظ قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے —— یہ اسی درس کی مزید توضیح ہے کہ اگر وہ کھلی آنکھوں سے اپنے ملک کو دیکھتے تو اس وسیع خوانِ کرم کو، جس پر اس فیاضی کے ساتھ ان کے لیے نعمتیں چنی گئی تھیں، دیکھ کر ان پر یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی کہ جس نے یہ خوانِ کرم بچھایا ہے وہ بڑا ہی غفار و ستار آقا ہے جس نے بلا کسی استحقاق کے، ان کی ناقدریوں اور ناشکریوں کے باوجود، ان کے لیے اپنی نعمتوں کے یہ انبار لگا دیے ہیں —— یہ حقیقت اس کتاب میں ہم جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں کہ نعمت پا کر منعم کی شکرگزاری کا شعور انسانی فطرت کا ایک بدیہی تقاضا ہے۔ یہ چیز حیوانات کی جبلت میں بھی داخل ہے۔ اگر کوئی انسان اس شعور سے عاری ہے تو وہ حیوانات سے بھی بدتر ہے۔

فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَىْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ (۱۶)

سدِ مآرب

'عَرِم' کے معنی بعض اہلِ لغت نے زوردار بارش کے لکھے ہیں اور بعض نے اس کو 'عَرِمَة' کی جمع بتایا ہے، جو تہ بہ تہ اکٹھا کیے ہوئے پتھروں کے لیے آتا ہے۔ پھر یہیں سے یہ اس سد یا بند کے لیے بھی استعمال ہونے لگا جو کسی وادی کے درمیان پانی کو روکنے کے لیے بنایا جاتا ہے۔ اقرب الموارد میں ہے 'مسناة تحبس به الوادی' (وہ بند جو وادی کے بیچ میں بنایا جائے) جس طرح ہمارے منگلا اور تربیلا ڈیم ہیں۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی طرح کا ایک کئی میل لمبا چوڑا ڈیم اہلِ سبا کا بھی تھا جو ان کو سیلاب کے خطرات سے محفوظ بھی کیے ہوئے تھا اور آب پاشی کے لیے بھی بقدرِ ضرورت اس سے ان کو پانی حاصل ہوتا تھا۔ تاریخوں میں اس کا ذکر سدِ مآرب کے نام سے آتا ہے۔ 'مآرب' سبا کا دار السلطنت تھا۔ یہ بند غالباً ۵۴۲ء میں ٹوٹا اور اس کے ٹوٹنے سے سارا ملک تباہ ہو گیا۔

ناشکری کا انجام

'فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ' یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ نعمتیں دیں تو ان کو پا کر وہ خدا کے شکرگزار ہونے کے بجائے طغیان و فساد میں مبتلا ہوئے۔ سورۂ نحل کی آیت ۱۱۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو انذار کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک رسول بھیجا لیکن انھوں نے اس کی پروا نہ کی بالآخر ان پر خدا کا عذاب اس شکل میں آیا کہ ایک عظیم سیلاب نے ان کے بند کو توڑ دیا جس سے ان کا سارا ملک تاراج ہو کر رہ گیا۔

'وَبَدَّلْنٰهُمْ الاٰیۃ'۔ 'خمط' بدمزہ، کڑوے کسیلے پھلوں کو کہتے ہیں۔ یعنی اس سیلاب نے ان کے ملک کو اس طرح تلپٹ کر کے رکھ دیا کہ شاداب باغوں کی جگہ کڑوے کسیلے پھلوں کے کچھ درخت اور کچھ جھاڑ اور بیری کی جھاڑیاں رہ گئیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیلاب نے صرف ان کے باغ ہی ویران نہیں کیے

بلکہ ان کے پورے علاقے پر کسی ایسی مٹی یا ریت کی تہ جما دی جس نے بچے کھچے درختوں کے مزاج بھی بدل دیے اور پورا علاقہ صرف جنگلی جھاڑیوں ہی کے لیے موزوں رہ گیا۔

ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ؕ وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ (۱۷)

'مجازات' کے معنی بدلہ دینے کے ہیں۔ بدلہ برا بھی ہوتا ہے اور اچھا بھی۔ اس وجہ سے اس کے صحیح مفہوم کا تعین موقع و محل سے ہوتا ہے۔ یہاں موقع برے بدلہ کا ہے اس وجہ سے یہاں یہ لفظ اسی معنی میں لیا جائے گا۔ فرمایا کہ ہم نے ان کو یہ سزا ان کے کفرانِ نعمت کی پاداش میں دی اور اس قسم کی سزائیں ہم ناشکروں کے سوا کسی اور کو نہیں دیتے۔

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ ؕ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اٰمِنِيْنَ (۱۸)

اہلِ سبا کی رفاہیت کی مزید تفصیل

'اَلْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا' سے ملک شام وغیرہ کی طرف اشارہ ہے جن کے ساتھ اہلِ سبا کے تجارتی تعلقات تھے۔ یہ ملک بہت زرخیز تھے اس وجہ سے ان کی صفت 'بٰرَكْنَا فِيْهَا' آئی ہے۔ زرخیز ممالک سے تجارتی تعلقات بجائے خود آمدنی اور رفاہیت کا ذریعہ ہوتے ہیں۔

'قُرًى ظَاهِرَةً' سے مراد وہ شہر اور قصبات ہیں جو اس شاہراہ پر واقع تھے جس کے دونوں جانب باغوں کی قطاریں تھیں۔ یعنی ان بستیوں کے علاوہ جو اندرونِ ملک واقع تھیں موزوں فاصلوں سے اس شاہراہ پر بھی بستیاں آباد تھیں جو ان کے لیے منزلوں کا کام دیتی تھیں۔ وہ ان میں بے خوف و خطر ٹھہرتے، آرام کرتے اور پھر آگے کی منزل کے لیے سفر کرتے۔

'وَقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ' یعنی یہ بستیاں ایسے مناسب فاصلوں پر واقع تھیں کہ گویا قدرت نے خود اپنے اہتمام سے ان کے لیے منزلیں مقرر کر دی تھیں۔

'سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اٰمِنِيْنَ'۔ یہ ان آسائشوں کی زبانِ حال کی تعبیر ہے کہ قدرت نے یہ سارا اہتمام کر کے گویا ان کے لیے ہر منزل پر یہ کتبہ لگا دیا کہ تمھاری خاطر یہ اہتمام ہم نے اس لیے کیا ہے کہ تم راتوں میں بھی اور دنوں میں بھی بے خوف و خطر سفر کر سکو —— یہاں اتنی بات حذف ہے کہ' اور اپنے اس رب کے شکر گزار رہو جس نے تمھارے لیے یہ سارا اہتمام کیا ہے' —— اس کو حذف کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ہر انعام کا یہ فطری تقاضا ہے اور اوپر آیت ۱۵ میں اس کا بیان ہو چکا ہے۔ اس وجہ سے اس کو دہرانے کے بجائے بعد والی آیت میں ان کے اس رویہ کی طرف اشارہ فرما دیا جو انھوں نے اختیار کیا اور جس کے نتیجہ میں وہ ان تمام نعمتوں سے محروم ہوئے۔

اس زمانے کی عام گمراہی کا اصلی سبب

یہاں یہ حقیقت ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام آسائشوں اور رفاہیتوں کے اہتمام کو براہِ راست اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔ یہ حقیقت نفس الامری کا بیان ہے کہ اس دنیا میں انسان کو جو فتوحات بھی حاصل

ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ کے فضل ہی سے حاصل ہوتی ہیں۔ لیکن انسان اپنی ناشکری کے باعث ہر چیز کو اپنی سعی و تدبیر کا کرشمہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس زمانے کی عام گمراہی کا اصلی سبب انسان کی یہی بے بصیرتی ہے اور سائنس کی ایجادات نے اس غرور میں اتنا اضافہ کر دیا ہے کہ اب اللہ ہی اس کو دور کر سکتا ہے۔

فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (۱۹)

زبانِ حال کی تعبیر

یہ ان کے زبانِ قال کی نہیں بلکہ زبانِ حال کی تعبیر ہے کہ انھوں نے یہ رفاہیتیں پا کر رویہ جو اختیار کیا اس سے یہ ظاہر کر دیا کہ وہ ان آسائشوں کے حقدار نہیں ہیں بلکہ اس بات کے سزاوار ہیں کہ ان کی بستیاں ویران ہو جائیں، ان کی منزلیں کٹھن ہو جائیں اور ان کی یہ ساری رفاہیتیں ان سے چھین لی جائیں۔ زبانِ حال کی تعبیرات کی مثالوں کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی نظیریں پیچھے گزر چکی ہیں اور یہ حقیقت بھی ہم واضح کر چکے ہیں کہ اصل شہادت زبانِ حال ہی کی ہوتی ہے نہ کہ زبانِ قول کی۔ یہود کا قول 'سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا' بھی ان کے حال ہی کی تعبیر ہے۔

'وَظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ' یعنی انھوں نے خدا کی ناشکری و نافرمانی کی اور اس طرح خود اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھائے کہ خدا کے قہر و غضب کو دعوت دی۔ خدا کا انھوں نے کچھ نہیں بگاڑا۔

'فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ' یہ ان کی ناشکری کا انجام بیان ہوا ہے کہ بالآخر وہ اس طرح پامال ہوئے کہ حاضر کے صفحہ سے مٹ کر صرف ماضی کی ایک داستانِ پارینہ بن کے رہ گئے۔ 'وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ' یعنی جو سیلاب کی آفت سے بچے بھی وہ بھی ملک کی معیشت برباد ہو جانے کے باعث بالکل پراگندہ ہو گئے۔ کوئی کہیں گیا کوئی کہیں۔

ایک قابلِ غور نکتہ

'اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ' اوپر آیت ۱۷ میں جس طرح اس سرگزشت کے اصل سبق کی طرف 'وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ' سے توجہ دلائی ہے اسی طرح یہاں اسی حقیقت کی طرف 'لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ' کے الفاظ سے توجہ دلائی ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اہلِ سبا کی سرگزشت یہاں دو مرتبہ دہرائی گئی ہے اور دونوں مرتبہ ان کے عبرت انگیز انجام کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ پہلے ان کے علاقے کی زرخیزی و شادابی کے ذکر کے بعد ان کی ناشکری اور اس کے انجام کی طرف اشارہ فرمایا پھر ان کی تمدنی و تجارتی ترقیوں کے ذکر کے بعد ان کے کفرانِ نعمت کے نتیجہ میں ان کے انتشار کی طرف۔ یہ اسلوب بیان اس لیے اختیار فرمایا گیا ہے کہ اصل مقصود جس کے لیے یہ سرگزشت سنائی جا رہی ہے نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ قرآن میں اس اسلوبِ بیان کی متعدد نہایت بلیغ مثالیں موجود ہیں۔

'صبر' اور 'شکر' کی نشانیاں

'صبر' اور 'شکر' دونوں توام ہیں۔ یہ دونوں بیک وقت مطلوب ہیں۔ جس کے اندر صبر نہ ہو وہ شکر کا حق ادا نہیں کر سکتا اور جس کے اندر شکر نہ ہو وہ صبر نہیں کر سکتا اور اس دنیا کے دارالامتحان میں ہر قدم پر بندے کا

امتحان ان دونوں ہی چیزوں میں ہوتا رہتا ہے اور اسی امتحان پر اس کی اُخروی کامیابی و ناکامی کا انحصار ہے۔ فرمایا کہ اس سرگزشت میں صبر و شکر کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ مثلاً

- اس دنیا میں جو نعمتیں بھی حاصل ہوتی ہیں وہ اللہ تعالیٰ ہی کی عطا کردہ ہوتی ہیں اس وجہ سے ان کو پا کر غرور میں مبتلا ہونے کے بجائے انسان کو اپنے رب کا شکر گزار اور اس کا فرمانبردار رہنا چاہیے۔
- جو نعمتیں بھی ملتی ہیں وہ کسی استحقاق کی بنا پر نہیں بلکہ امتحان کے طور پر ملتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو دے کر دیکھتا ہے کہ اس کے بندے اس کے شکر گزار رہتے ہیں یا ناشکری کرتے ہیں۔
- اس امتحان میں جو قومیں ناکام ہو جاتی ہیں وہ قومی حیثیت سے اس دنیا میں اس کا انجام دیکھ لیتی ہیں۔ آخرت میں ہر شخص کے سامنے انفرادی حیثیت سے اس کا انجام آئے گا۔

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ إِبْلِيسُ ظَنَّهُ فَاتَّبَعُوهُ إِلَّا فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ (۲۰)

ناشکرے لوگ ابلیس کی توقعات پوری کرتے ہیں۔

یہ ابلیس کے اس گمان کی طرف اشارہ ہے جس کا اظہار اس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے اس وقت کیا تھا جب آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا اس کو حکم دیا گیا اور اس نے اس کی تعمیل سے انکار کیا۔ اس وقت اس نے یہ کہا تھا کہ میں اولادِ آدم پر اس طرح گھیرے ڈالوں گا کہ ان کی اکثریت تیری جگہ میری پیروی کرے گی۔ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ (الاعراف: ۱۷) (اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہیں پائے گا) یہاں اس کا حوالہ دینے سے مقصود اس کے انجام کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ جب انھوں نے اپنے بارے میں ابلیس کے گمان کو سچا ثابت کر دیا تو لازماً ان کے سامنے اس کا انجام بھی آیا اور آئے گا یعنی اس دنیا میں یہ سیلاب کے عذاب سے دوچار ہوئے اور آخرت میں یہ جہنم کے عذاب میں جھونک دیے جائیں گے۔ قرآن میں جہاں ابلیس کی مذکورہ بالا دھمکی کا ذکر ہے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ جواب بھی مذکور ہے کہ 'جو تیری پیروی کریں گے خواہ جنوں میں سے ہوں یا انسانوں میں سے، میں ان سب کو جہنم میں بھر دوں گا۔'

'إِلَّا فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ' پیچھے سورۂ نحل کی آیت ۱۱۳ کے حوالہ سے ہم ذکر کر آئے ہیں کہ اہلِ سبا کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک رسول بھی بھیجا تھا۔ اس آیت سے واضح ہوا کہ ان کی اکثریت نے اس رسول کی تکذیب کر دی۔ صرف تھوڑے سے لوگ ان پر ایمان لائے اور وہی اس عذاب سے محفوظ رہے جو ان کی قوم پر آیا۔

وَمَا كَانَ لَهُ عَلَيْهِم مِّن سُلْطَانٍ إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يُؤْمِنُ بِالْآخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِي شَكٍّ وَرَبُّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ (۲۱)

ایک شبہ کا ازالہ

یہ ایک دفع دخلِ مقدر یعنی بر سرِ موقع ایک شبہ کا ازالہ ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ مبتلا رہے کہ شیطان کو لوگوں پر کوئی اختیار حاصل ہے کہ وہ جس کو چاہے گمراہ کر دے۔ فرمایا کہ شیطان کو اس طرح کا کوئی اختیار اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر نہیں دیا ہے۔ اس کو صرف اس بات کی مہلت ملی ہے کہ وہ لوگوں کو بدی کے راستہ کی دعوت دے سکتا ہے اور یہ مہلت اس کو اس لیے دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کا امتحان کرنا

چاہتا ہے کہ کون آخرت پر ایسا مضبوط ایمان رکھتا ہے کہ شیطان کی ترغیبات کے باوجود جادۂ حق پر استوار رہتا ہے اور کون شک میں مبتلا ہے کہ شیطان کے بہکانے سے اس کی راہ پر لگ جاتا ہے۔ 'لِنَعْلَمَ' سے پہلے کوئی فعل 'انظرناہ' یا 'امھلناہ' کے معنی میں محذوف ہے اور اس قسم کے حذف کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

'وَرَبُّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ' یعنی اللہ تعالیٰ اس رزم گاہِ امتحان میں شیطان اور انسان کو اتار کر خود الگ تھلگ ہو کر نہیں بیٹھ رہا ہے بلکہ ہر چیز کی نگرانی کر رہا ہے۔ مجال نہیں ہے کہ شیطان اپنے حدود سے متجاوز ہو سکے اور ممکن نہیں ہے کہ انسان اپنی کسی دادرسی سے محروم رہ جائے۔ اگر انسان اپنا فرض اپنے امکان کی حد تک ادا کرنے کی کوشش کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی اس دنیا میں بھی مدد فرمائے گا اور آخرت میں بھی اس کی ہر سعی کا بھرپور صلہ دے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیطان اور اس کی ذریات کے غلبہ سے مایوس ہو کر ادائے فرض سے دستکش ہونا جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو مہلت تو ضرور دی ہے لیکن اپنی دنیا اس کے حوالے نہیں کر دی ہے، بلکہ ہر چیز کی نگرانی وہ خود فرما رہا ہے۔

۴- آگے کا مضمون - آیات ۲۲ - ۲۷

اوپر کی آیات میں یہ حقیقت واضح فرمائی کہ تمام رحمت و نعمت اللہ ہی کے اختیار میں ہے اس وجہ سے شکرگزاری اور بندگی کا حقیقی سزاوار وہی ہے۔ اب آگے مشرکین کو چیلنج کیا ہے کہ تم اپنے جن معبودوں کو خدا کا شریک بنائے بیٹھے اور ان کی سفارش کی امید پر خدا کی پکڑ سے بے فکر ہو ان کے حق میں کوئی دلیل اپنے پاس رکھتے ہو تو اس کو پیش کرو۔ ساتھ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ اعلان کرایا ہے کہ اگر تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، محض ضد اور مکابرت کی وجہ سے اپنی بات پر اڑے ہوئے ہو تو تمہارے ساتھ بحث میں ہم اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے بلکہ معاملہ اللہ کے حوالہ کرتے ہیں۔ وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے ــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۲ - ۲۷

قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا یَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِیْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِیْرٍ ﴿۲۲﴾ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ؕ حَتّٰۤی اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْكَبِیْرُ ﴿۲۳﴾ قُلْ مَنْ یَّرْزُقُكُمْ مِّنَ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾ قُلْ لَّا تُسْـَٔــلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْـَٔــلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ۭ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ﴿۲۶﴾ قُلْ اَرُوْنِيَ الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَاۗءَ كَلَّا ۭ بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۷﴾

ترجمہ آیات ۲۲-۲۷

بلاؤ ان کو جن کو تم نے خدا کے سوا معبود گمان کر رکھا ہے! وہ نہ آسمانوں میں ذرہ برابر کوئی اختیار رکھتے ہیں اور نہ زمین میں۔ اور نہ ان دونوں میں ان کا کوئی ساجھا ہے اور نہ ان میں سے کوئی اس کا مددگار رہے۔ اور اس کے ہاں کوئی شفاعت کارگر نہیں ہوگی مگر اس کے لیے جس کے لیے وہ اجازت دے۔ یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے دہشت دور ہوگی وہ پوچھیں گے کہ تمھارے رب نے کیا حکم فرمایا؟ وہ جواب دیں گے کہ بالکل حق ارشاد ہوا! اور وہ نہایت عالی مقام اور عظیم ہے! ۲۳

ان سے پوچھو، تم کو آسمانوں اور زمین سے کون رزق بہم پہنچاتا ہے؟ کہو، اللہ! اور ہم میں اور تم میں سے کوئی ایک ہدایت پر ہے یا کھلی ہوئی گمراہی میں! کہہ دو، نہ ہم نے جو جرم کیے ان کی بابت تم سے پرسش ہونی ہے اور نہ تمھارے اعمال سے متعلق ہم سے سوال ہوگا۔ کہہ دو، ہمارا رب ہم سب کو جمع کرے گا پھر ہمارے درمیان بالکل انصاف کے مطابق فیصلہ فرمائے گا اور وہی فیصلہ فرمانے والا اور علم والا ہے۔ ۲۴-۲۶

کہو، ذرا مجھے ان کو دکھاؤ تو جن کو تم نے شریک بنا کر اس کے ساتھ جوڑ رکھا ہے! ہرگز نہیں! بلکہ وہ اللہ عزیز و حکیم ہے! ۲۷

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ (۲۲)

مشرکین کو کھلا ہوا چیلنج

یہ مشرکین کو کھلا ہوا چیلنج ہے کہ جن کو تم نے خدا کا شریک گمان کر رکھا ہے ذرا ان کو بلاؤ، ہم بھی ان کی صورت دیکھیں وہ کیسے اور کہاں ہیں! اس قسم کا چیلنج مخاطب کو اس وقت دیا جاتا ہے جب اس کا دعویٰ بالکل ہی بے سر دپا ہوا ور ہر پہلو سے اس پر حجت تمام کی جا چکی ہو۔ یہی اندازِ خطاب آگے آیت ۲۷ میں ہے: قُلْ اَرُوْنِيَ الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَآءَ كَلَّا ۚ بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (ان سے کہو، ذرا مجھے ان کو دکھاؤ جن کو تم نے شریک بنا کر خدا کے ساتھ جوڑ رکھا ہے! ہرگز نہیں! بلکہ وہ اللہ عزیز و حکیم ہے)۔

لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ۔ یہ اسی چیلنج کی مزید وضاحت ہے کہ تم نے ان کو شریکِ خدا گمان کر رکھا ہے حالانکہ نہ وہ آسمانوں میں ذرہ برابر کوئی اختیار رکھتے نہ زمین میں۔ یہی بات اسی سورہ کی پہلی ہی آیت میں اس طرح واضح فرمائی گئی ہے لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (اسی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے)۔

وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ: یعنی ان دونوں کی خلقت میں ان کا کوئی بھی ساجھا نہیں ہے۔ دوسرے مقام میں فرمایا ہے: مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الکہف ۵۱) (میں نے آسمانوں اور زمین کی خلقت کے وقت ان میں سے کسی کو نہیں بلایا کہ ذرہ برابر وہ میرا ہاتھ بٹائیں)۔

وَمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ: یعنی زمین و آسمان کے انتظام و انصرام میں بھی خدا نے ان میں سے کسی کو اپنا معین و مددگار نہیں بنایا ہے بلکہ اپنی ساری خدائی کا انتظام تنہا وہ خود ہی سنبھالے ہوئے ہے اور یہ چیز ذرا بھی اس پر بار نہیں ہے۔ یہ مشرکین کے اس وہم کی تردید ہے کہ زمین چونکہ خدا کی مملکت کا نہایت دور دراز علاقہ ہے اس وجہ سے اس کا انتظام اس نے اپنے دوسرے شریکوں کے سپرد کر رکھا ہے۔

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ۚ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ (۲۳)

مشرکین کے مزعومہ تصورِ شفاعت کی نفی

حق و اختیار کی نفی کے بعد یہ ان کے مزعومہ تصورِ شفاعت کی بھی نفی کر دی۔ فرمایا کہ اگر ان کی شفاعت کی امید پر بیٹھے ہو تو یاد رکھو کہ خدا کے حضور میں کسی کی شفاعت کسی کے لیے نافع نہیں ہوگی مگر اس کے لیے جس کے لیے خدا اجازت دے یعنی اول تو خدا کے اذن کے بدون کوئی کسی کی شفاعت کی جرأت

ہی نہیں کرے گا، پھر اجازت کے بعد بھی وہ شفاعت صرف اسی کے لیے کرے گا جس کے لیے اس کو اجازت مرحمت ہوئی ہوگی۔ کسی ایسے کے بارے میں وہ زبان نہیں کھول سکے گا جس کے لیے اس کو اجازت نہ ملی ہو۔ دوسرے مقامات میں یہ وضاحت بھی فرما دی گئی ہے کہ وہ وہی بات کہے گا جو حق ہوگی۔ خدائے علام الغیوب کے آگے نہ کوئی کسی باطل کو حق بنا سکے گا اور نہ کوئی بات حق کے خلاف زبان سے نکال سکے گا۔

یہ مشرکین کے اس گمان کی تردید ہے جو وہ اپنے معبود فرشتوں سے متعلق رکھتے تھے کہ وہ خدا کی چہیتی بیٹیاں ہیں، اس وجہ سے وہ اپنے باپ سے جو بات چاہیں منوا سکتی ہیں اور خدا کو ان کی ناز برداری میں ان کی ہر بات ماننی پڑتی ہے۔

حَتّٰٓی اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ قَالُوا الْحَقَّ

'تفزیع' کے اصل معنی تو ڈرا دینے اور دہشت زدہ کر دینے کے ہیں لیکن جب اس کا صلہ 'عن' کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی دہشت دور کر دینے کے ہو جاتے ہیں۔ 'فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ' کے معنی ہوں گے 'جب ان کے دلوں سے دہشت دور کر دی جائے گی'۔

قیامت کے روز فرشتوں کا حال

یہ حال بیان ہوا ہے قیامت کے دن فرشتوں کا کہ اس دن آگے بڑھ کر ناز و تدلل کے ساتھ کسی کی شفاعت کرنا تو الگ رہا تمام خلق کی طرح ان پر بھی اس دن ایسا ہول طاری ہوگا کہ انھیں کچھ خبر نہیں ہوگی کہ لوگوں کے باب میں رب العزت کی بارگاہ سے کیا حکم صادر ہوا۔ جب ان کی دہشت دور ہوگی تو وہ دوسروں سے سوال کریں گے کہ تمھارے رب کی طرف سے کیا حکم صادر ہوا؟ وہ جواب دیں گے کہ بالکل بجا حکم صادر ہوا ہے۔

فرشتوں سے متعلق مشرکین کے اسی تصور کی تردید کرتے ہوئے سورۂ زمر میں یوں ارشاد فرمایا ہے:

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَ الْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ۚ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۞ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۖ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ۞ (الزمر ۳۹: ۶۷-۶۸)	اور انھوں نے اللہ کی صحیح شان نہیں پہچانی! اور وہ زمین کو قیامت کے دن مٹھی میں لے لے گا اور آسمان ان کی بساط بھی اس کے ہاتھ میں لپیٹی ہوئی ہوگی۔ وہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ اور صور پھونکا جائے گا تو جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے، مگر جن کو اللہ محفوظ رکھنا چاہے۔ پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو سب اٹھ کھڑے ہوں گے تاکتے ہوئے۔

یہ باتیں احوال قیامت سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ ان کا صحیح تصور اس دنیا میں ممکن نہیں ہے لیکن یہ دونوں

آیتیں ایک ہی موقع و محل کی ہیں اس وجہ سے اگر آیت زیر بحث کا مفہوم سورۂ زمر کی مذکورہ بالا آیت کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے تو یہ بات نکلتی ہے کہ جب پہلی دفعہ صور پھونکا جائے گا تو آسمانوں اور زمین کی تمام مخلوقات بے ہوش ہو کر گر پڑیں گی۔ صرف وہی لوگ اس سے محفوظ رہ سکیں گے جن کو اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ انہی لوگوں کا ذکر دوسرے مقام میں یوں آیا ہے ’لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَکْبَرُ‘ (الانبیآء ۱۰۳) (ان کو سب سے بڑے ہول کا غم لاحق نہیں ہوگا) پھر جب دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو سب لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے اور حیرت و دہشت کے ساتھ دیکھیں گے کہ یہ کیا ہوگیا اور کیا ہونے والا ہے! معلوم ہوتا ہے اسی مرحلے میں فرشتے وہ سوال کریں گے جو ’مَاذَا قَالَ رَبُّکُمْ‘ کے الفاظ سے یہاں مذکور ہے۔ اس سوال سے ان کی سراسیمگی اور دہشت زدگی کا اظہار ہو رہا ہے کہ نازو اعتماد کے ساتھ آگے بڑھ کر کسی کی سفارش کرنا تو درکنار صورتِ حال ایسی ہوگی کہ خود ان کے اپنے اوسان بجا نہیں رہیں گے۔ وہ دوسروں سے پوچھیں گے کہ بارگاہِ الٰہی سے کیا حکم صادر ہوا ہے؟ دوسرے جواب میں صرف یہ کہیں گے کہ جو حکم ہوا ہے وہ بالکل حق ہے۔ ’الْحَقَّ‘ فعل محذوف سے منصوب ہے۔ یہ جواب ان لوگوں کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے جن کے معاملات کا اس دن فیصلہ ہوگا اس لیے کہ اس دن حق اس طرح واضح ہو جائے گا کہ کوئی بھی یہ کہنے کی جرأت نہ کر سکے گا کہ اس کے ساتھ کوئی ناانصافی ہوئی ہے اور امکان اس کا بھی ہے کہ یہ جواب ان لوگوں کی طرف سے ہو جو اس دن کے ہول سے محفوظ رکھے جائیں گے اور جن کی طرف سورۂ زمر کی مذکورہ بالا آیت میں ’اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ‘ کے الفاظ سے اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اگر یہ جواب ان لوگوں کی طرف سے مانا جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس دن اکثریت کا حال تو یہ ہوگا کہ ان کو خود اپنی پڑی ہوگی وہ دوسروں کی سفارش کیا کریں گے اور جو اس دن کے ہول سے امان میں رکھے جائیں گے ان کا حال یہ ہوگا کہ وہ پکاریں گے کہ ربِّ عادل و کریم نے جو فیصلہ فرمایا ہے وہ بالکل حق فرمایا ہے ___ مطلب یہ ہے کہ جب اصل حقیقتِ حال یہ ہے تو وہ کون لوگ ہیں جن کی شفاعت پر مشرکین تکیہ کیے ہوئے ہیں!

’وَهُوَ الْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ‘ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی ہی بلند و ارفع اور بڑی باعظمت و باجبروت ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس کے آگے اس کے اذن کے بغیر زبان کھول سکے اور نہ کسی کی یہ شان ہے کہ اس تک اس کی رسائی ہو سکے۔

فرشتوں میں سب سے زیادہ عالی مقام حضرت جبریل امین ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ تک رسائی کے معاملے میں ان کی بے بسی کا بھی یہ حال ہے کہ

اگر یک سر موئے برتر پرم
فروغِ تجلّی بسوزد پرم

اس مسئلہ پر مزید بحث ان شاء اللہ اگلی سورہ میں آئے گی۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۲۴)

ایک مسلّم حقیقت

یعنی ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین سے کون تم کو روزی دیتا ہے؟ کون آسمانوں سے پانی برساتا، سورج چمکاتا اور موسمی تغیرات پیدا کرتا ہے اور کون زمین سے بیجوں کو اگاتا، سبزوں کو نشو ونما دیتا اور فصلوں کو بارآور کرتا ہے؟

'قُلِ اللّٰهُ' فرمایا کہ ان کو بتا دو کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کرتا ہے اور آسمانوں اور زمین کی یہ سازگاری اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ ان دونوں کے اندر ایک ہی خدائے قادر و قیوم کا ارادہ کارفرما ہے۔

یہاں سوال کرنے کے بعد اس کا جواب بھی خود ہی دے دیا ہے۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ اس جواب سے مخاطب کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ اہلِ عرب کے عقائد سے متعلق یہ بات ہم اس کے محل میں واضح کر چکے ہیں کہ وہ اپنی دیویوں دیوتاؤں میں سے کسی کو خالق یا رازق نہیں مانتے تھے بلکہ صرف سفارشی اور ذریعۂ تقرب مانتے تھے۔ قرآن میں یہ تصریح موجود ہے کہ اگر ان سے پوچھو کہ تم کو آسمانوں اور زمین سے کون روزی دیتا ہے تو جھٹ جواب دیں گے کہ اللہ! چونکہ یہ بات مخاطب کو تسلیم تھی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وہی مسلّم حقیقت یہاں ان کے سامنے رکھ دی ہے۔

ضدی مخاطب سے موادعت کا اعلان

'وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ' مطلب یہ ہے کہ اسی مسلّم حقیقت پر ہماری دعوت کی بنیاد ہے۔ اگر تم اس پر ہم سے جھگڑ رہے ہو تو مزید کسی بحث وجدال کی ضرورت نہیں ہے۔ یا تو ہم ہدایت پر ہیں اور تم کھلی ہوئی گمراہی میں ہو یا تم ہدایت پر ہو اور ہم ضلالت پر ہوں گے —— مطلب یہ ہے کہ جب تم ضد میں اس حد تک دھاندلی پر اتر آئے ہو کہ ایک ہی سانس میں ایک حقیقت کو مانتے ہو، پھر اسی کو جھٹلاتے ہو تو تم سے مزید بحث جاری رکھنا بے سود ہے۔ اب تمہارا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ وہی فیصلہ فرمائے گا کہ کون ہدایت پر ہے اور کون ضلالت پر! ہمارے نزدیک یہ ٹکڑا موادعت کے مفہوم میں ہے نہ کہ ملاطفت کے مفہوم میں، جیسا کہ عام طور لوگوں نے سمجھا ہے۔

قُلْ لَّا تُسْئَلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْئَلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۲۵)

یہ وہی قطعِ حجت کا مضمون، جو اوپر والی آیت میں ہے، دوسرے الفاظ میں ہے۔ فرمایا کہ اگر تمہارے نزدیک ہم تمہارے معبودوں اور تمہارے آبائی رسوم کی مخالفت کے مجرم ہیں تو عند اللہ اس جرم کی مسئولیت ہمارے ہی اوپر ہے، تمہارے اوپر نہیں ہے۔ اسی طرح تم جو کچھ کر رہے ہو اس کی پرسش ہم سے نہیں ہونی ہے، تمہی سے ہونی ہے۔ ہمارے اوپر حق کو پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی، یہ فرض ہم نے ادا کر دیا۔ اب مزید بحث وجدال سے کچھ حاصل نہیں۔ تم اپنی راہ چلو، ہم اپنی راہ چلتے ہیں۔ کل کو اللہ تعالیٰ کے حضور فیصلہ ہو جائے گا کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر۔ یہی مضمون سورۂ شوریٰ کی آیت ذیل میں

یوں آیا ہے:

لَنَآ اَعۡمَالُنَا وَلَکُمۡ اَعۡمَالُکُمۡ ؕ لَا حُجَّۃَ بَیۡنَنَا وَبَیۡنَکُمۡ (۱۵) — ہمارے ساتھ ہمارے اعمال ہوں گے اور تمھارے ساتھ تمھارے اعمال، اب ہمارے اور تمھارے درمیان کسی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔

یہی قطعِ بحث کا مضمون سورۂ کافرون میں ہے 'لَکُمۡ دِیۡنُکُمۡ وَلِیَ دِیۡنِ' (۶) (تمھارے لیے تمھارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین) قرآن مجید میں یہ مضمون، مختلف اسلوبوں سے، جگہ جگہ آیا ہے اور اس کا ایک خاص محل ہے۔ وہ یہ کہ جب مخاطب نے اپنی ضد اور مکابرت سے بالکل واضح حقائق کو جھٹلا دینے کی کوشش کی ہے تو اس سے یہ کہہ دیا گیا ہے کہ اب بحث و مناظرہ سے کچھ حاصل نہیں، تم اپنا کام کرو، ہم اپنا کام کرتے ہیں۔ اس طرح کی آیات کو عام طور پر لوگوں نے مخاطب کے ساتھ اظہارِ رواداری کے مفہوم میں لیا ہے لیکن یہ اظہارِ رواداری کے مفہوم میں نہیں بلکہ اظہارِ بیزاری کے مفہوم میں ہیں۔ سیاق و سباق پر نگاہ نہ رکھنے کے سبب سے لوگوں کو غلط فہمی ہوئی۔

قُلۡ یَجۡمَعُ بَیۡنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ یَفۡتَحُ بَیۡنَنَا بِالۡحَقِّ ؕ وَہُوَ الۡفَتَّاحُ الۡعَلِیۡمُ (۲۶)

یعنی ان سے کہہ دو کہ اگر یہاں تم ہماری بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہو تو نہ مانو، ایک ایسا دن آنے والا ہے جس میں ہمارا رب ہم کو اور تم کو، دونوں کو، جمع کرے گا اور پھر بالکل ٹھیک ٹھیک فیصلہ فرمائے گا کہ کون حق پر تھا اور کون باطل پر۔ وہ بہت بڑا فیصلہ کرنے والا ہے۔ اس کے فیصلہ کے خلاف کوئی دھاندلی مچانا کسی کے بس میں نہ ہوگا اور وہ ہر چیز کا پورا پورا علم رکھنے والا ہے۔ کوئی چیز اس سے مخفی نہیں ہے۔

قُلۡ اَرُوۡنِیَ الَّذِیۡنَ اَلۡحَقۡتُمۡ بِہٖ شُرَکَآءَ کَلَّا ؕ بَلۡ ہُوَ اللّٰہُ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ (۲۷)

ایک طنزیہ سوال اور اس کا جواب

وہی مضمون جو اس مجموعۂ آیات کی پہلی آیت میں آیا ہے آخر میں دوسرے اسلوب سے پھر ارشاد ہوا ہے۔ اس کا انداز طنز و تحقیر اور تہدید و وعید کا ہے۔ فرمایا کہ ان سے کہو کہ ذرا مجھے ان کو دکھاؤ تو سہی جن کو تم نے شریکوں کی حیثیت سے خدا کے ساتھ چپکا رکھا ہے! آخر وہ کون اور کہاں ہیں جو ایسے عالی مقام ہیں کہ وہ خدا کی خدائی میں ساجھی بنا دیے گئے ہیں!

'کَلَّا ؕ بَلۡ ہُوَ اللّٰہُ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ' سوال کے بعد خود ہی اس کا جواب دے دیا کہ ہرگز نہیں! کسی کا بھی یہ درجہ و مرتبہ نہیں ہے کہ اس کو خدا کا شریک قرار دیا جا سکے۔ اس کے بعد اس نفی کی دلیل اللہ تعالیٰ کی مسلّمہ صفات سے دی ہے۔ فرمایا کہ وہ 'عزیز' و 'حکیم' ہے۔ 'عزیز' یعنی سب کی رسائی سے بالاتر اور ہر چیز پر غالب و مقتدر۔ 'حکیم' یعنی اس کا ہر فعل غایت و حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ ان صفات کا ذکر حصر کے اسلوب میں فرمایا ہے یعنی وہ ان صفات سے کمال درجہ متصف ہے اور جب وہ ان سے کمال درجہ متصف ہے تو ان کے ساتھ شرک کا کوئی جوڑ نہیں ہے اس لیے کہ اگر کسی کو اس کا شریک

اس پہلو سے مانا جائے کہ اس کائنات کے خلق و تدبیر میں خدا اس کا محتاج ہے تو یہ اس کے عزیز ہونے کی نفی ہے اور اگر اس پہلو سے مانا جائے کہ کوئی اپنی رسائی و تقرب سے اس کے بے لاگ عدل پر اثر انداز ہو سکتا ہے تو یہ اس کے حکیم ہونے کی نفی ہوئی۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ مشرکین کے شرک میں اصلی عامل کی حیثیت انہی دونوں غلط فہمیوں کو حاصل تھی۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی ان دونوں صفتوں کا حوالہ دے کر ان دونوں غلط فہمیوں کی بنیاد ڈھا دی۔

۶۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۲۸-۳۹

آگے کی آیات میں مخالفین کے ان مطالبات و اعتراضات سے تعرض فرمایا ہے جو وہ قرآن کی دعوت اور اس کے انذار کی تکذیب کے لیے پیش کر رہے تھے۔ اعتراضات و مطالبات کے جواب بھی دیے ہیں اور اس انجام کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے جس سے وہ لوگ لازماً دوچار ہوں گے جو ان لاطائل اعتراضات و شبہات کی آڑ لے کر حقیقت کو جھٹلائیں گے ۔۔۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۸-۲۹

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٢٨﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٢٩﴾ قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿٣٠﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ۚ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ الْقَوْلَ ۚ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٣١﴾ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ﴿٣٢﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ۭ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۭ

وَجَعَلْنَا الْأَغْلَالَ فِي أَعْنَاقِ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا
كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٣٣﴾ وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ
مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ ﴿٣٤﴾ وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ
أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ﴿٣٥﴾ قُلْ إِنَّ رَبِّي يَبْسُطُ
الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٦﴾
وَمَا أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُم بِالَّتِي تُقَرِّبُكُمْ عِندَنَا زُلْفَىٰ إِلَّا مَنْ
آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ لَهُمْ جَزَاءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوا
وَهُمْ فِي الْغُرُفَاتِ آمِنُونَ ﴿٣٧﴾ وَالَّذِينَ يَسْعَوْنَ فِي آيَاتِنَا مُعَاجِزِينَ
أُولَٰئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُونَ ﴿٣٨﴾ قُلْ إِنَّ رَبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ
لِمَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ لَهُ ۚ وَمَا أَنفَقْتُم مِّن
شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ ۖ وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ﴿٣٩﴾

ترجمۂ آیات
۲۸-۳۹

اور ہم نے تو تم کو سب لوگوں کے واسطے بس بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جان رہے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ دھمکی کب ظاہر ہو گی، اگر تم لوگ سچے ہو! ان کو بتا دو کہ تمھارے لیے ایک خاص دن کی میعاد مقرر ہے جس سے نہ ذرا پیچھے ہٹو گے اور نہ آگے بڑھو گے۔ ۲۸-۳۰

اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ کہتے ہیں نہ تو ہم اس قرآن پر ایمان لانے کے اور نہ اس چیز ہی پر جس کی وہ آگے کو خبر دے رہا ہے اور اگر تم اس وقت کو دیکھ پاتے جب کہ یہ ظالم اپنے رب کے حضور کھڑے کیے جائیں گے! ان کے آپس میں تو تکار ہو رہی ہو گی۔ جو لوگ دبا کے رکھے گئے وہ ان لوگوں سے جنھوں نے تکبر کیا، کہیں گے کہ اگر تم لوگ نہ ہوتے تو ہم ضرور

ایمان لانے والوں میں سے ہوتے۔ وہ لوگ جو بڑے بنے ان لوگوں کو جو دبا کے رکھے گئے، جواب دیں گے کہ کیا ہم نے تم کو ہدایت سے روکا جب کہ وہ تمھارے پاس آچکی تھی! بلکہ تم خود ہی مجرم ہو۔ اور دبے ہوئے لوگ متکبرین سے کہیں گے، بلکہ تمھاری رات دن کی سازشیں تھیں (جو قبول حق میں مانع ہوئیں) جب کہ تم ہمیں سمجھاتے تھے کہ ہم اللہ کا کفر کریں اور اس کے شریک ٹھہرائیں۔ اور وہ دلوں میں نادم ہوں گے جب دیکھیں گے عذاب کو۔ اور ہم کافروں کی گردنوں میں طوق ڈالیں گے۔ یہ وہی بدلہ میں پائیں گے جو وہ کرتے رہے تھے۔ ۳۱۔۳۳

اور ہم نے جس بستی میں بھی کوئی نذیر بھیجا تو اس کے اغنیاء نے یہی کہا کہ ہم تو اس پیغام کے منکر ہیں جو دے کر تم بھیجے گئے ہو۔ اور انھوں نے کہا کہ ہم تو تم سے مال و اولاد میں بڑھ کر ہیں، اور ہم کبھی مبتلائے عذاب ہونے والے نہیں ہیں۔ ان سے کہہ دو، میرا رب ہی ہے جو رزق کشادہ کرتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے، لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔ اور تمھارے مال اور تمھاری اولاد وہ چیز نہیں ہے جو تم کو ہمارا مقرب بنا دینے والی ہو۔ البتہ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے وہ لوگ ہیں کہ ان کے لیے ان کے اعمال کا مضاعف صلہ ہوگا اور وہ بالا خانوں میں چین سے براجمان ہوں گے۔ ۳۴۔۳۷

اور جو زک دینے کے لیے ہماری آیات کے ابطال کی راہ میں سرگرم ہیں وہ لوگ عذاب میں داخل کیے جائیں گے۔ ۳۸

کہہ دو، میرا رب ہی ہے جو رزق کو کشادہ کرتا ہے اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے اس کے لیے (اگر چاہتا ہے) اور جو کوئی چیز بھی تم خرچ

کروگے تو وہ اس کا بدلہ دے گا اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے۔ ۳۹

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۲۸)

رسول کی ذمہ داری صرف انذار اور بشارت ہے

یہ اظہارِ افسوس ہے ان لوگوں کی حالت پر جو قرآن کی دعوتِ توحید اور اس کے انذارِ عذاب و قیامت کی تکذیب کے لیے عذاب کا مطالبہ کرتے تھے تاکہ اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کر سکیں۔ فرمایا کہ ہم نے تم کو عذاب لانے والا نہیں بلکہ لوگوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے کہ تم ان لوگوں کو نجات اور رحمت کی بشارت دے دو جو تمھاری دعوت پر ایمان لا کر ایمان و عمل صالح کی زندگی اختیار کر لیں گے۔ اور ان لوگوں کو خدا کے اس قہر و غضب سے آگاہ کر دو جس سے تمھاری تکذیب کی صورت میں ان کو لازماً سابقہ پیش آئے گا۔ تمھاری ذمہ داری اس انذار و بشارت کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ عذاب لانے یا نہ لانے کا معاملہ ہم سے متعلق ہے۔ جب اس کا وقت آ جائے گا تو ہم یہ چیز بھی ان کو دکھا دیں گے۔

'وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ'۔ یہ لوگوں کی بدبختی پر اظہارِ افسوس ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو عذاب سے پہلے ایک آگاہ کرنے والا بھیج دیا کہ لوگ چاہیں تو ایمان و عمل صالح کی زندگی اختیار کر کے اپنے لیے ابدی رحمت کی ضمانت حاصل کر لیں لیکن لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ رحمت کی جگہ عذاب ہی کے طالب ہیں۔ ان کو اس حقیقت کی خبر نہیں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کی طرف رسول بھیج دیتا ہے تو اس پر اللہ کی حجت تمام ہو جاتی ہے۔ اگر وہ قوم رسول کی تکذیب کر دیتی ہے تو سنت الٰہی کے بموجب وہ لازماً تباہ کر دی جاتی ہے۔ آگے والی سورہ، سورۂ فاطر میں اس حقیقت کی وضاحت یوں فرمائی گئی ہے:

اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ ہ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ	تم تو بس ایک آگاہ کر دینے والے ہو۔ ہم نے
بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ط وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ	تم کو حق کے ساتھ بشارت دینے والا اور آگاہ
اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ہ وَاِنْ	کرنے والا بنا کر بھیجا ہے اور کوئی امت ایسی
يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ	نہیں ہوئی ہے جس میں ایک نذیر نہ آیا ہو۔ اور اگر
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ج جَآءَتْهُمْ	یہ تم کو جھٹلاتے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ان
رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالزُّبُرِ	سے پہلے جو قومیں گزری ہیں انھوں نے بھی جھٹلایا۔
وَبِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ہ ثُمَّ اَخَذْتُ	ان کے پاس ان کے رسول واضح نشانیاں، صحیفے اور
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَكَيْفَ كَانَ	روشن کتاب لے کر آئے۔ پھر میں نے ان لوگوں کو پکڑا

تفسیر ۲۳ - ۲۰ جنھوں نے کفر کیا تو دیکھو کیسی ہوئی میری پھٹکار۔

اہل کتاب کو ایک برمحل تنبیہ

اس آیت میں 'کَآفَّةً لِّلنَّاسِ' کے الفاظ بھی قابلِ غور ہیں۔ آنحضرتؐ سے پہلے جو رسول آئے وہ صرف اپنی اپنی قوموں ہی کے لیے نذیر بن کر آئے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خاتم الانبیاء و خاتم الرسل ہیں اس وجہ سے آپ کی بعثت تمام خلق کی طرف ہوئی۔ یہ حقیقت قرآن میں بھی مختلف پہلوؤں سے واضح فرمائی گئی ہے اور سابق صحیفوں میں آپ کی نسبت جو پیشین گوئیاں وارد ہیں، ان میں بھی آپ کی یہ حیثیت نمایاں ہے۔ ان کے حوالے سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم نقل کر آئے ہیں۔ یہاں اس بات کی یاد دہانی سے مقصود اہل کتاب کو متنبہ کرنا ہے۔ دعوت کے اس دور میں انھوں نے بھی درپردہ قریش کی پشت پناہی شروع کر دی تھی، اس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس صفت کا حوالہ دے کر ان کو بھی آگاہ کر دیا گیا کہ جس رسول کی مخالفت میں وہ اپنی ذہانت و قابلیت صرف کر رہے ہیں وہ صرف قریش ہی کے لیے منذر و مبشر بن کر نہیں آیا ہے بلکہ اس کے ذریعے سے خود ان کی قسمت کا بھی فیصلہ ہونا ہے اس وجہ سے اگر وہ یہ خطرناک کھیل کھیلنا چاہتے ہیں تو اس کے نتائج بہت دور تک سوچ لیں۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (۲۹)

استہزا کرنے والوں کو جواب

یعنی وہ رسول کے انذار بالعذاب سے متنبہ ہونے اور اس سے اپنے آپ کو بچانے کی فکر کرنے کے بجائے رسول اور اس کے ساتھیوں کا استخفاف کرتے اور باندازِ طنز سوال کرتے ہیں کہ اگر تم لوگ اپنے انذار میں سچے ہو تو یہ بتاؤ کہ یہ دھمکی کب ظہور میں آئے گی؟ مطلب یہ ہے کہ یا تو اس کو دکھاؤ یا اس کا وقت متعین کرو ورنہ ہم اس کو محض لاف زنی سمجھتے ہیں۔

قُل لَّكُم مِّيعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَأْخِرُونَ عَنْهُ سَاعَةً وَلَا تَسْتَقْدِمُونَ (۳۰)

فرمایا کہ ان کو جواب دے دو کہ اس چیز کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔ اس کے ظہور کے لیے ایک خاص وقت مقرر ہے۔ جب وہ وقت آ جائے گا تو پھر نہ تو اس سے پیچھے ہٹ سکو گے اور نہ آگے ہی بڑھ سکو گے۔ یہ حقیقت ہم جگہ جگہ واضح کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نافرمانوں اور باغیوں کو بھی اتنی مہلت دیتا ہے کہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں تاکہ ان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہ جائے اور یہ بات صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کسی قوم کا پیمانہ کب لبریز ہوا۔ اس بھید سے اللہ کا رسول بھی واقف نہیں ہوتا۔ لفظ 'یوم' یہاں وقت کے مفہوم میں ہے اور لفظ 'ساعۃ' لمحہ، پل اور وقتِ قلیل کے مفہوم میں۔

اس اسلوبِ بیان کے اندر سوال کرنے والوں کے طنز کے جواب میں یہ طنز بھی مضمر ہے کہ آخر کس برتے پر اس عذاب کا وقت معلوم کرنا چاہتے ہو، وہ اٹل وقت جب آ جائے گا تو پھر کسی کے ٹالے نہ ٹل سکے گا!

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَن نُّؤْمِنَ بِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَلَا بِالَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ ۗ وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ مَوْقُوفُونَ عِندَ رَبِّهِمْ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ الْقَوْلَ يَقُولُ الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا

لِلَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡا لَوۡلَاۤ اَنۡتُمۡ لَکُنَّا مُؤۡمِنِیۡنَ (۳۱)

'الذی بین یدیہ' کی تاویل

'وَلَا بِالَّذِیۡ بَیۡنَ یَدَیۡہِ' کی دو تاویلیں لوگوں نے کی ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد قرآن سے پہلے نازل ہونے والے آسمانی صحیفے ہیں، دوسری یہ کہ یہ اس عذاب اور قیامت کی طرف اشارہ ہے جس سے قرآن ان کو آگاہ کر رہا تھا۔ ہمارے نزدیک یہ دوسرا قول سیاق و سباق سے زیادہ اوفق ہے۔ یعنی یہ کفار نہایت ڈھٹائی کے ساتھ قرآن کے انذار کا یہ جواب دیتے ہیں کہ نہ تو ہم اس قرآن ہی پر ایمان لانے والے ہیں اور نہ اس عذاب اور قیامت ہی کو ماننے کے لیے تیار ہیں جس کی وہ آگے کو خبر دے رہا ہے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم سے یہ بات منوانی ہے تو ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ یہ چیز ہمیں دکھا دی جائے۔ اگر یہ دکھائی نہیں جاتی تو پھر ہم اس دھونس میں آنے والے نہیں ہیں!

حذف کا ایک اسلوب

'وَلَوۡ تَرٰۤی اِذِ الظّٰلِمُوۡنَ مَوۡقُوۡفُوۡنَ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ'۔ 'ظٰلِمُوۡنَ' سے مراد یہی شامت زدہ لوگ ہیں جو خدا کی رحمت کو ٹھکرا کر اس کی نقمت کا مطالبہ کر رہے تھے۔ جواب شرط یہاں عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق محذوف ہے۔ حذف کا یہ طریقہ ان مواقع میں اختیار کیا جاتا ہے جہاں صورت حال تعبیر و تصویر سے ماوراء ہو۔ مطلب یہ ہے کہ آج تو یہ شامت زدہ لوگ قرآن اور اس کے بعد آنے والی قیامت کا نہایت جسارت سے انکار کر رہے ہیں لیکن اگر تم کہیں ان کی اس حالت کو دیکھ پاتے جب کہ یہ اپنے رب کے حضور میں کھڑے کیے جائیں گے تو......۔ اس 'تو' کے بعد اس منظر کا ذکر حذف کر دیا ہے جس سے یہ بات نکلی کہ اس کی ہولناکی تعبیر و تصویر کے حدود سے باہر ہے۔

لیڈروں اور اس کے پیروؤں کی تو تکار

'یَرۡجِعُ بَعۡضُہُمۡ اِلٰی بَعۡضِ ۣ الۡقَوۡلَ' کا صحیح مفہوم یہ ہوگا کہ وہ آپس میں تو تکار کریں گے۔ اس کی تفصیل آگے کی آیات میں آ رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج تو ان کے لیڈر اور پیرو دونوں قرآن اور قیامت کی مخالفت پر متفق ہیں۔ لیڈر مخالفت کے لیے پیش پیش ہیں اور عوام ان کی تائید کرتے ہوئے ان کے جھنڈے اٹھائے پھر رہے ہیں لیکن جب خدا کے حضور میں ان کی پیشی ہوگی تو پیرو لیڈروں کو اپنی گمراہی کا ذمہ دار ٹھہرائیں گے اور لیڈر پیروؤں کو ملامت کریں گے کہ تم اپنی شامت کے خود ذمہ دار ہو کہ حق کے واضح ہو جانے کے بعد تم نے حق کے بجائے ہماری پیروی کی۔ مطلب یہ ہے کہ آج تو لیڈر عوام کو یہ باور کرا رہے ہیں کہ وہ ان کی صوابدید پر اعتماد کریں، خیر و شر کی ذمہ داری ان پر ہے اور عوام آنکھ بند کر کے ان کے پیچھے چل رہے ہیں کہ کوئی خطرہ پیش آیا تو ان کے لیڈر اس سے ان کو بچا لیں گے لیکن جب اصل مرحلہ سامنے آئے گا تب معلوم ہوگا کہ ہر ایک اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے، کوئی دوسرا کسی کا بوجھ اٹھانے والا نہیں بنے گا۔

'یَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا لِلَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡا لَوۡلَاۤ اَنۡتُمۡ لَکُنَّا مُؤۡمِنِیۡنَ'۔ یہ اوپر والی بات کی وضاحت ہو رہی ہے۔ 'الَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا' سے مراد وہ غرباء اور عوام ہیں جو اپنی غربت اور بے مائگی

کے سبب سے بڑوں اور سرمایہ داروں کے زبردست اوران کے آلۂ کار بنے رہے۔ 'اَلَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا' سے ان کے سرمایہ دار لیڈر اور سردار مراد ہیں جنھوں نے اپنی ذات کو حق و باطل کا معیار بنا کر لوگوں کو اپنے پیچھے چلایا یہاں تک کہ اللہ و رسول کی مخالفت کے لیے بھی ان کو استعمال کیا۔ فرمایا کہ اس دن غربا اور عوام اپنے لیڈروں اور سرمایہ داروں کو الزام دیں گے کہ یہ تم ہو کہ تمھاری بدولت ہم اس بدبختی سے دوچار ہوئے، تم نے ہماری راہ نہ ماری ہوتی تو ہم ضرور ایمان لانے والوں میں سے بنتے۔ مطلب یہ ہے کہ حق تو ہم سے مخفی نہیں رہا تھا اور ہمارے اندر اس کے اختیار کرنے کا جذبہ بھی ابھرتا تھا لیکن تمھارا دباؤ ہمارے اس جذبے کو دبا دیتا تھا اور ہم اپنی خواہش کے خلاف ایمان کی سعادت سے محروم رہ گئے اور بالآخر اس انجام کو پہنچے۔

قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰکُمْ عَنِ الْهُدٰی بَعْدَ اِذْ جَآءَکُمْ بَلْ کُنْتُمْ مُّجْرِمِیْنَ (۳۲)

لیڈر اپنے پیروؤں کو جھٹ جواب دیں گے کہ تمھارا الزام بالکل غلط ہے کہ تم کو ہم نے اللہ کی ہدایت سے روکا بلکہ مجرم تم خود ہو کہ نہایت واضح ہدایت آ جانے کے بعد بھی تم ہمارے پیرو بنے رہے۔ مطلب یہ ہے کہ حق نہ تو ہم پر مخفی تھا نہ تم پر۔ اللہ کے رسول نے حجت تمام کر دی تھی۔ یہ بات نہ ہوئی ہوتی تب تو کسی حد تک ہم کو الزام دینے میں تم بجانب حق ہوتے لیکن جب تم نے پورے دن کی روشنی میں ٹھوکر کھائی تو ہم کو مجرم ٹھہرانے کے بجائے اپنے سر پیٹو۔ ہم بھی مجرم ہیں اور ہماری ہی طرح تم بھی مجرم ہو ——— یہ بات ہے تو کفار کی لیکن قرآن نے یہ ایک سچی بات کی حیثیت سے نقل کی ہے اور اس میں ہر دور کے عوام کے لیے درسِ عبرت ہے کہ حق و ہدایت کے معاملے میں کوئی شخص مجرد اس عذر پر عند اللہ بری نہیں ہو سکتا کہ اس کو دوسروں نے گمراہ کیا بلکہ حق کی جستجو ہر شخص کی اپنی ذمہ داری ہے اور اس کے واضح ہونے کے بعد اس کی پیروی تا حدِ امکان ہر فرد پر لازم ہے۔ اس کے بغیر کوئی عند اللہ بری نہیں ہو سکتا۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا بَلْ مَکْرُ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ نَّکْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ط وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ط وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِیْٓ اَعْنَاقِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ط هَلْ یُجْزَوْنَ اِلَّا مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۳۳)

عوام لیڈروں کے جواب میں کہیں گے کہ یہ تمھاری رات دن کی سازشیں تھیں کہ ہم حق کی پیروی سے محروم رہے۔ تم نے رسول کی ہدایت سے برگشتہ کرنے کے لیے پروپیگنڈے کی مہم چلا رکھی تھی اور ہمیں تم یہ سمجھاتے اور سکھاتے تھے کہ ہم برابر کفر و شرک پر جمے رہیں ——— اس جواب سے یہ بات نکلی کہ ان کو اس امر کا تو اعتراف ہو گا کہ حق ان پر واضح تھا لیکن وہ اس وجہ سے اس کی پیروی نہ کر سکے کہ ان کے لیڈروں

کی رات دن کی سازشوں نے انھیں اس کی پیروی سے محروم رکھا۔

'وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ'۔ 'اَسَرُّوا النَّدَامَةَ' اسی طرح کا محاورہ ہے جس طرح 'ابطن العداوۃ' ہے۔ 'نَدَامت' ایک کیفیت قلبی و باطنی ہے اس وجہ سے اس کے لیے 'اسرّ' استعمال ہوا ہے۔ مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اس سوال و جواب کے بعد جب وہ دیکھیں گے کہ سامنے عذاب کھڑا ہے تو وہ اپنی بدبختی پر سخت پشیمان ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا یہ عذر مسموع نہیں ہوگا کہ وہ اپنے لیڈروں کی سازشوں کے سبب سے ہدایت کی پیروی سے محروم رہے بلکہ ان کو لازماً عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ان کی پشیمانی کی وجہ یہ ہوگی کہ اس وقت ان کے سامنے یہ بات بالکل کھل کر آجائے گی کہ فی الحقیقت انھوں نے بالکل اپنے ضمیر کے خلاف اپنے لیڈروں کی پیروی کی۔ جو آدمی اپنے ضمیر کے خلاف کسی باطل کی پیروی کرتا ہے جب اس کا نتیجہ اس کے سامنے آتا ہے تو اس کو صرف نتیجہ کی تلخی ہی سے سابقہ نہیں پڑتا بلکہ اپنے ضمیر کی لعنت سے بھی اس کو دوچار ہونا پڑتا ہے اور یہ چیز اس کی مصیبت کو دوچند کر دیتی ہے۔ یہ مضمون احزاب کی آیات ۶۶-۶۸ میں گزر چکا ہے۔ مزید وضاحت مطلوب ہو تو اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

عمل اور جزا میں مشابہت

'وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِیْٓ اَعْنَاقِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا'۔ فرمایا کہ ہم ان کافروں کی گردنوں میں طوق ڈال دیں گے۔ یہ عمل اور جزا میں مطابقت کی طرف اشارہ ہے۔ جو لوگ اپنی عقل اور اپنے ضمیر کو بالکل معطل کر کے اپنی باگ دوسروں کے ہاتھ میں پکڑا دیں گے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کو اس کی سزا یہ دے گا کہ ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیے جائیں گے جن کو پکڑ کر دوزخ کے داروغے ان کو دوزخ میں گھسیٹیں گے۔

'هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ'۔ یعنی ان کی گردنوں میں یہ طوق جو ڈالے جائیں گے تو یہ ان کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی بلکہ دنیا میں جو کچھ انھوں نے کیا اسی کی اصل حقیقت ان کے سامنے اس شکل میں آئے گی۔ انھوں نے دوسروں کی غلامی کا قلادہ اپنی گردنوں میں ڈال کر اپنے رب کی نافرمانی کی جس کے نتیجہ میں ان کو دوزخ کے یہ اغلال اپنی گردنوں میں ڈالنے پڑیں گے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۳۴)

آنحضرت صلعم کو تسلی

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تمہارے زمانے کے امراء و اغنیاء جو کچھ تمہارے ساتھ کر رہے ہیں یہی کچھ ہر زمانے کے مترفین نے اپنے اپنے زمانوں کے رسولوں کے ساتھ کیا ہے۔ انھوں نے بھی نہایت رعونت کے ساتھ اپنے رسولوں کو یہ جواب دیا کہ جو پیغام تم دے کر بھیجے گئے ہو ہم اس سارے کے منکر ہیں۔ یعنی نہ تو تمہاری دعوتِ توحید و ایمان کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں اور نہ تمہاری اس دھونس ہی میں آنے والے ہیں کہ اگر ہم نے تمہاری بات نہ مانی تو ہم پر کوئی عذاب آجائے گا۔

'اُرْسِلْتُمْ بِہٖ' کے اسلوب میں یہ بات بھی مضمر ہے کہ جس رسالت کے تم مدعی ہو یہ بھی محض تمہارا زعم ہے جس کی ہمارے نزدیک کوئی حقیقت نہیں ہے۔

وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ (۳۵)

مترفین کا اصلی مغالطہ

یعنی رسولوں کے انذار کی تکذیب کے حق میں جو دلیل انھوں نے پیش کی وہ یہی تھی جو تمھارے زمانے کے مترفین پیش کر رہے ہیں۔ انھوں نے رسول اور اس کے ساتھیوں کو جواب دیا کہ تم ہمیں ڈراتے ہو کہ ہمارا عقیدہ و عمل باطل ہے اور ہم خدا کے عذاب کے سزاوار ہیں اور حال یہ ہے کہ ہم مال و اولاد میں تم سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں۔ اگر تمھاری بات سچی ہوتی تو اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ مال و اولاد میں تم ہم سے بڑھ چڑھ کر ہوتے۔ 'وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ' یعنی جب صورتِ حال علانیہ تمھاری تکذیب کر رہی ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ تم محض لاف زنی کر رہے ہو، ہم پر نہ اس دنیا میں کوئی عذاب آنے والا ہے اور نہ آخرت میں (اگر تمھارے زعم کے مطابق وہ ہوئی) ہمیں کسی عذاب کا کوئی اندیشہ ہے۔

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۶)

مغالطہ کا ازالہ

فرمایا کہ ان کا یہ مغالطہ رفع کرنے کے لیے ان کو بتا دو کہ اس دنیا میں مال و اولاد کی زیادتی نہ تو خدا کے منظورِ نظر ہونے کی دلیل ہے اور نہ اس کی کمی خدا کی نظروں میں حقیر ہونے کی۔ بلکہ یہ کمی و زیادتی تمام تر اللہ تعالیٰ کے اختیار اور اس کی حکمت پر منحصر ہے۔ وہ کسی کے رزق میں کشادگی دیتا ہے تو اس کے شکر کا امتحان کرتا ہے اور کسی کے رزق کو تنگ کرتا ہے تو اس کے صبر کو جانچتا ہے اور اصل کامیابی کا انحصار درحقیقت اس امتحان کے نتیجہ پر ہے جو آخرت میں سامنے آئے گا۔

'وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ' لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے ناآشنا ہیں۔ وہ اس حماقت میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان کو جو مال و جاہ حاصل ہے یہ ان کی قابلیت و استحقاق کا کرشمہ اور خدا کے ہاں ان کے مقرب و منظورِ نظر ہونے کی دلیل ہے۔ اس طرح وہ شیطان کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کو اپنے لیے عذاب بنا لیتے ہیں۔

وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۡ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ (۳۷)

'زُلْفٰى' مصدر ہے جس سے مقصود فعل کی تاکید ہے یعنی 'تُقَرِّبُكُمْ قُرْبَةً'۔ مطلب یہ ہے کہ مال و اولاد ان چیزوں میں سے نہیں ہیں جو خدا کے ہاں ذرا بھی وجہ قربت ہو سکیں۔ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ امتحان کے لیے دیتا ہے کہ ان کو پا کر بندہ اس کی ناشکری کرتا ہے یا ایمان و عمل صالح کی راہ اختیار کرتا ہے۔ اس وجہ سے خدا کے ہاں تقرب کا ذریعہ مال و اولاد نہیں بلکہ ایمان و عمل صالح ہے۔ اگر کسی نے ایمان و عمل صالح کی کمائی نہیں کی تو اس کے لیے مال و اولاد کی زیادتی صرف اس کے وبال میں

اضافہ کرے گی۔

'جزاء الضعف' کا مفہوم

'فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا' لفظ 'ضعف' عربی میں کسی شے کے مثل کے لیے بھی آتا ہے اور اس کے امثال کے لیے بھی، خواہ وہ امثال کتنے ہی غیر محدود ہوں۔ اس وجہ سے اس ٹکڑے کا مفہوم یہ ہوگا کہ البتہ وہ لوگ جو ایمان و عمل صالح کی روش اختیار کریں گے ان کے لیے ان کے اعمال کا مضاعف صلہ ہوگا۔ اس مضاعف صلہ کی وضاحت قرآن مجید کے دوسرے مقامات میں ہوئی ہے۔ اس کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔ اس کو دُگنے اجر کے محدود مفہوم میں نہ لیجیے۔[1]

'وَهُمْ فِى الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ' یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اس دنیا میں تو مال و اولاد کے لیے ہر وقت خطرات ہیں اور کوئی بھی ان خطرات سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں کر سکتا لیکن جو لوگ مال و اولاد کو آخرت کی فلاح کا ذریعہ بناتے ہیں ان کو اس کا جو صلہ ملے گا وہ ابدی اور لازوال ہوگا۔ اس باب میں پھر ان کو کبھی کوئی تشویش لاحق نہیں ہوگی۔

وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِىْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ فِى الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ (۳۸)

یہ ان لوگوں کے انجام کا بیان ہے جنھوں نے مال و اولاد کی زیادتی کو اللہ کی آیات کو جھٹلانے اور رسول کو زچ کرنے کے لیے دلیل کے طور پر استعمال کیا۔ فرمایا کہ یہ لوگ پکڑ کر خدا کے عذاب میں لائے جائیں گے تاکہ اپنے کبر و غرور کی سزا بھگتیں۔ لفظ 'مُحْضَرُوْنَ' میں ان کی ذلت اور بے بسی کی جو تصویر ہے وہ ظاہر ہے۔

قُلْ اِنَّ رَبِّىْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (۳۹)

رزق و فضل کا صحیح مصرف

اس آیت کی تمہید اور اوپر کی آیت ۳۶ کی تمہید بعینہٖ ایک ہی ہے لیکن دونوں جگہ مدعا الگ الگ ہے۔ اوپر کی آیت میں یہ واضح فرمایا ہے کہ رزق کی کشادگی و تنگی تمام تر اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اس وجہ سے نہ اس کی کشادگی پر کسی کو اترانے کا حق ہے اور نہ اس کی تنگی سے کسی کو مایوس ہونا چاہیے، بلکہ ہر شخص کو یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ یہ دونوں حالتیں اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت پیش آتی ہیں اور دونوں سے وہ اپنے بندوں کے شکر یا صبر کا امتحان کرتا ہے۔ اس آیت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرمائی کہ ان معترضین کو یہ بتا دو کہ اللہ کے بخشے ہوئے رزق و فضل پر اکڑنے کے بجائے اس کو

---

[1] صاحب اقرب الموارد نے اس لفظ کی تشریح یوں کی ہے:

وجائز فی کلام العرب ان یکون الضعف المثل الواحد وما زاد علیہ من الامثال فیقال لک ضعفہ ای مثلاہ وثلاثۃ امثالہ لانہ فی الاصل زیادۃ غیر محصورۃ۔

خدا کی خوشنودی کے کاموں میں صرف کریں کہ یہی شکر کا تقاضا ہے اور وہ اطمینان رکھیں کہ جو کچھ بھی وہ خدا کی راہ میں خرچ کریں گے وہ ضائع جانے والا نہیں ہے، بلکہ وہ چھوٹے سے چھوٹے انفاق کا بھی بھرپور صلہ دے گا۔ اور یہ صلہ کے معاملے میں 'جَزَاءً الضِّعْفِ' کا اصول بیان ہو چکا ہے اور اس کی وضاحت بھی ہو چکی ہے۔ آیت میں 'وَمَآ اَنْفَقْتُمْ' کے بعد 'فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ' کے الفاظ وضاحت قرینہ کی بنا پر حذف ہیں۔ 'اَخْلَفَ اللّٰہُ عَلَیْکَ' کے معنی ہوں گے 'رَدَّ عَلَیْکَ مَا ذَھَبَ' (تمھاری گئی ہوئی چیز خدا نے تمھیں لوٹا دی)۔

'وَھُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ' یعنی خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے اطمینان رکھیں کہ اللہ تعالیٰ بہترین رزق دینے والا ہے۔ آج وہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ان کے خرچ کیے ہوئے خزف ریزوں کے عوض میں کل وہ ان کو کیا کچھ بخش سکتا ہے اور کیا کچھ بخش دے گا۔ لفظ 'خَیْر' یہاں ترجیح و تفضیل کے مفہوم میں نہیں بلکہ مطلق بیانِ صفت کے لیے ہے۔ اس اسلوب کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

۸۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۴۰-۴۵

آگے معترفین کو متنبہ کیا ہے کہ تم فرشتوں کو معبود بنا کر ان کی پرستش کر رہے ہو اور سمجھتے ہو کہ آخرت کا مرحلہ پیش آیا تو وہ تم کو بچا لیں گے حالانکہ آخرت میں وہ تم سے اعلان برارت کریں گے اور خدا کے عذاب سے تم کو کوئی بچانے والا نہیں بنے گا۔ یہ اللہ نے تم پر بہت بڑا احسان فرمایا ہے کہ تمھیں آگاہ کرنے کے لیے رسول بھیجا ہے لیکن تم بدبختی کے سبب سے اس کے کلام کو سحر قرار دے رہے ہو۔ بہتر ہے کہ ماضی کی قوموں کے انجام سے سبق لو۔ ان کو جو کچھ حاصل ہوا اس کا عُشرِ عشیر بھی تم حاصل نہیں کر پائے ہو لیکن جب وہ اللہ کی پکڑ میں آ گئے تو پھر کوئی بھی ان کو پناہ دینے والا نہ بن سکا ــــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۰-۴۵

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوا يَعْبُدُونَ ﴿۴۰﴾ قَالُوا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُونِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُونَ ﴿۴۱﴾ فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّلَا ضَرًّا ۗ وَنَقُولُ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ الَّتِي كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُونَ ﴿۴۲﴾ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوا مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ

يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ۚ وَقَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ اِفْكٌ مُّفْتَرًى ؕ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۳﴾ وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ ؕ ﴿۴۴﴾ وَكَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۙ وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَيْنٰهُمْ فَكَذَّبُوْا رُسُلِيْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۵﴾

ع ۵ / ۹ / ۱۱

ترجمہ آیات ۴۰ - ۴۵

اور اس دن کو یاد رکھو جس دن وہ ان سب کو اکٹھا کرے گا پھر فرشتوں سے پوچھے گا کہ کیا یہ لوگ تمھاری پرستش کرتے رہے ہیں! وہ جواب دیں گے کہ تو پاک ہے۔ ان کے بالمقابل تو ہمارا کارساز ہے! بلکہ یہ جنوں کی پرستش کرتے رہے ہیں، ان کی اکثریت انہی پر ایمان رکھتی تھی۔ ۴۱

پس آج تم میں سے کوئی ایک دوسرے کو نہ تو کوئی نفع پہنچا سکے گا اور نہ نقصان۔ اور ہم ان ظالموں سے کہیں گے کہ اب اس دوزخ کے عذاب کا مزا چکھو جس کو جھٹلاتے رہے ہو! ۴۲

اور جب ان کو ہماری روشن آیات سنائی جاتی ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ یہ تو محض ایک شخص ہے جو چاہتا ہے کہ تم کو ان چیزوں سے روک دے جن کو تمھارے باپ دادا پوجتے آئے۔ اور انھوں نے کہا کہ یہ تو بس ایک من گھڑت جھوٹ ہے! اور ان کافروں نے حق کی بابت، جب کہ وہ ان کے پاس آگیا، کہا کہ یہ تو بس کھلا ہوا جادو ہے! اور ہم نے ان کو کتابیں نہیں دی تھیں جن کو وہ پڑھتے ہوں اور نہ ان کی طرف تم سے پہلے کوئی آگاہ کرنے والا بھیجا۔ ۴۴

اور ان سے پہلے والوں نے بھی جھٹلایا۔ اور یہ تو اس کے عشر عشیر کو بھی نہ پہنچے جو ہم

نے ان کو دیا۔ تو انھوں نے میرے رسولوں کی تکذیب کی تو دیکھو، کیسی ہوئی ان پر میری پھٹکار! ۴۵

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ أَهٰٓؤُلَآءِ إِيَّاكُمْ كَانُوا يَعْبُدُونَ (۴۰)

قیامت کے دن فرشتوں کی گواہی

'جَمِيعًا' کی تاکید اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ قیامت کے دن کفار و مشرکین بھی اکٹھے کیے جائیں گے اور ان کے خلاف گواہی دلوانے کے لیے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو بھی اکٹھا کرے گا جن کی عبادت کے وہ مدعی رہے ہوں گے یا جن کی طرف انھوں نے اپنی بدعات منسوب کی ہوں گی۔ سورۂ مائدہ میں حضرات انبیاء علیہم السلام کی شہادت کا ذکر گزر چکا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ان تمام بدعات سے اپنی براءت کا اعلان کریں گے جو ان کے بعد ان کے مبتدع پیروؤں نے ایجاد کی ہوں گی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ فرشتوں کو بھی اکٹھا کر کے ان سے سوال کرے گا کہ یہ مشرکین (اشارہ مشرکینِ عرب کی طرف ہے) مدعی ہیں کہ یہ تمھاری عبادت کرتے رہے ہیں تو کیا ان کا یہ دعویٰ صحیح ہے؟ اس سوال کا مقصد ظاہر ہے کہ مشرکین پر اتمامِ حجت ہوگا کہ جن کو وہ شریک و شفیع سمجھ کر زندگی بھر پوجتے رہے ان کو نہ تو ان کی اس عبادت کی خبر ہے نہ انھوں نے اس کا ان کو حکم دیا اور نہ وہ ایک لمحہ کے لیے یہی گوارا کرنے کے لیے تیار ہیں کہ کوئی ان کو پروردگارِ عالم کا شریک بنا کر ان کی عبادت کرے۔

قَالُوا سُبْحٰنَكَ أَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُونِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ ۚ أَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُؤْمِنُونَ (۴۱)

فرشتے اس سوال کا فوراً یہ جواب دیں گے کہ 'سُبْحٰنَكَ' تو اس سے پاک اور ارفع ہے کہ تیرا شریک و سہیم ہو!

فرشتوں کے جواب کے چند خاص پہلو

فرشتوں کے اس جواب سے ایک حقیقت تو یہ واضح ہوئی کہ شرک ایک ایسی گھناؤنی چیز ہے کہ اس کا ذکر سنتے ہی وہ اس سے اپنی نفرت کا اظہار کریں گے اور اللہ جل شانہٗ کو اس سے ارفع قرار دیں گے کہ کوئی اس کا شریک و سہیم ہو۔

دوسری یہ بات واضح ہوئی کہ وہ اپنے اوپر اس کو ایک سنگین تہمت خیال کریں گے کہ کچھ ظالموں نے ان کو شرک کی گندگی میں ملوث کرنے کی کوشش کی۔

تیسری یہ بات نکلی کہ جن احمقوں نے ایسا کیا ہے اس کی ذمہ داری تمام تر انھی پر ہے۔ فرشتے اس سے بری ہیں کہ وہ کسی کو اپنی عبادت کا حکم دیں۔

'اَنْتَ وَلِیُّنَا مِنْ دُوْنِہِمْ' یہ فرشتوں کا اپنے رب سے استغاثہ ہوگا کہ ان ظالموں کے مقابل میں، جنھوں نے ہمیں اس جرم میں ملوث کرنے کی کوشش کی، تو ہمارا یاور و ناصر اور مولیٰ و مرجع ہے۔ ہم ان سے بری ہیں تو ہمیں ان کی تہمت سے بری فرما۔ 'مِنْ دُوْنِہِمْ' یہاں مقابل کے مفہوم میں ہے۔

مشرکین کی جنات پرستی

'بَلْ کَانُوْا یَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَکْثَرُہُمْ بِہِمْ مُّؤْمِنُوْنَ'۔ یعنی ان کا یہ زعم تو بالکل باطل ہے کہ یہ ہماری پرستش کرتے رہے ہیں البتہ یہ امر واقعی ہے کہ یہ لوگ جنوں کی پرستش کرتے رہے ہیں اس لیے کہ ان کی اکثریت انہی پر ایمان رکھنے والی تھی۔

فرشتوں کا یہ جواب بالکل حقیقت کے مطابق ہوگا۔ اس لیے کہ فرشتوں کے نام سے انھوں نے جو بت بنائے ــــ مثلاً لات، منات اور عزّیٰ وغیرہ ــــ یہ تو محض ان کے اپنے فرض کیے ہوئے نام تھے جن کا کوئی مسمّی موجود نہیں تھا۔ البتہ اپنے کاہنوں کے توسط سے انھوں نے جنوں سے رابطہ قائم کیا تھا اور چونکہ ان کو وہ علم غیب کا ذریعہ سمجھتے تھے اس وجہ سے ان کے لیے چڑھاوے اور قربانیاں بھی پیش کرتے اور ان کی جے بھی پکارتے۔ 'اَکْثَرُہُمْ بِہِمْ مُّؤْمِنُوْنَ' یعنی یہ ان پر اس حیثیت سے ایمان رکھتے رہے ہیں کہ وہ غیب کی خبروں کے لانے والے اور بذاتِ خود نافع و ضار ہیں۔

فَالْیَوْمَ لَا یَمْلِکُ بَعْضُکُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ وَنَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِیْ کُنْتُمْ بِہَا تُکَذِّبُوْنَ (۴۲)

فرشتوں کی گواہی کے بعد ان کے پجاریوں کا فیصلہ

یعنی فرشتوں کے اس جواب کے بعد ان کے پجاریوں سے کہہ دیا جائے گا کہ تمھارا سارا اعتماد جن فرشتوں پر تھا ان کی گواہی تم نے علیٰ رؤوس الاشہاد سن لی۔ پس آج کے دن کوئی بھی ایک دوسرے کے کام آنے والا نہ بن سکے گا۔ نہ وہ تمھیں کوئی نفع یا ضرر پہنچا سکتے اور نہ تم ان کو۔

'وَنَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا ۔۔۔۔۔۔۔۔' میں 'اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا' سے مشرکین مراد ہیں جنھوں نے بے دلیل خدا کے شریک بنا کر 'ظلم عظیم' کا ارتکاب کیا اور جب پیغمبر نے ان کو خدا کے عذاب سے ڈرایا تو انھوں نے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ اس کی تکذیب کی۔ فرمایا کہ اس آخری اتمام حجت کے بعد ہم ان سے کہیں گے کہ اب اس دوزخ کا مزا چکھو جس کو جھٹلاتے رہے ہو۔

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْہِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوْا مَا ھٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ یُّرِیْدُ اَنْ یَّصُدَّکُمْ عَمَّا کَانَ یَعْبُدُ اٰبَآؤُکُمْ ۚ وَقَالُوْا مَا ھٰذَآ اِلَّآ اِفْکٌ مُّفْتَرًی ؕ وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَہُمْ ۙ اِنْ ھٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ (۴۳)

مخالفین کی ہٹ دھرمی پر اظہار تعجب

یہ ان لوگوں کی ہٹ دھرمی اور مکابرت پر اظہار تعجب اور ان کی محرومی و بدبختی پر اظہار افسوس ہے کہ یہ آفتاب پر خاک ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جب ان کو ہماری نہایت روشن، محکم اور عقل و دل کو متوجہ کر دینے والی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو یہ اپنے عوام کو ان کے خلاف یہ کہہ کر بھڑکاتے ہیں کہ یہ شخص

تمھارے ان معبودوں سے تم کو برگشتہ کرنا چاہتا ہے جن کو تمھارے بزرگ اسلاف برابر پوجتے آئے۔ حقائق کے خلاف عوام کو مشتعل کرنے کے لیے اسلاف کا حوالہ ہمیشہ سے مفسدین کے ہاتھ میں ایک کارگر حربہ رہا ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو کہ یہ واحد دلیل ہے جو ضلالت کے علمبردار لیڈروں نے اپنی ضلالتوں کے حق میں پیش کی ہے۔ 'مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ' کی تنکیر میں بھی ایک زہر چھپا ہوا ہے۔ یعنی وہ اپنے عوام کو پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ شخص جو اپنے آپ کو ایک فرستادۂ الٰہی کی حیثیت سے تمھارے سامنے پیش کر رہا ہے تم اس کے اس چکمے میں نہ آؤ، یہ محض ایک عام قسم کا آدمی ہے جس نے محض تمھارے دینِ آبائی سے تم کو منحرف کرنے کے لیے یہ روپ دھارا ہے کہ اس کو خدا نے تمھاری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے۔

'وَقَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ اِفْكٌ مُّفْتَرًى' یہ قرآن کے خلاف ان کے پروپیگنڈے کا حوالہ ہے کہ وہ اپنے عوام کو یہ باور کراتے ہیں کہ اس قرآن کے متعلق یہ دعویٰ جو کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اتارا ہے، یہ دعویٰ بالکل جھوٹ ہے جو محض تمھیں مرعوب کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک خود تراشیدہ کتاب ہے جو بالکل جھوٹ موٹ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کی جا رہی ہے۔

'وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ' یہ ان لوگوں کی اس تراژ خائی پر اظہارِ حیرت ہے کہ یہ لوگ حق کی مخالفت میں اس وقت یہ سخن سازیاں کر رہے ہیں جب حق ان کے سامنے ظاہر ہو چکا ہے۔ اگر سورج افق سے غائب ہو اور کوئی ہٹ دھرم اس کے متعلق کوئی سوال اٹھائے تو یہ ہٹ دھرمی چنداں حیرت انگیز نہیں، لیکن جب سورج نصف النہار پر چمک رہا ہو اور کوئی اس کو جادو قرار دے تو یہ محض خرد باختگی ہے۔

'لِلْحَقِّ' میں 'حق' سے مراد قرآن ہے اور 'ل' یہاں 'فی' کے مفہوم میں ہے۔ اس معنی میں اس کا استعمال معروف ہے۔ اس کتاب میں اس کی مثالیں گزر چکی ہیں۔

'اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ' یہ ان کے قول کی تفصیل ہے کہ اس قرآن کو وہ جادو قرار دیتے ہیں۔ قرآن کو جادو قرار دینے کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں کہ اس کی معجزانہ فصاحت و بلاغت اور تاثیر و تسخیر کے قائل تو اس کے کٹر سے کٹر مخالفین بھی تھے لیکن وہ اپنے عوام کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ یہ تاثیر و تسخیر محض اس کے پیش کرنے والے کی جادو بیانی کا کرشمہ ہے، اس کو خدا اور فرشتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

'وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ (۴۴)'

یہ ان مخالفین پر اظہارِ احسان اور ان کی اس ناقدری و محرومی پر اظہارِ افسوس ہے۔ فرمایا کہ یہ امّی اور قرآن و کتاب سے ناآشنا لوگ رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ اللہ نے ان کو کوئی کتاب دی تھی جو

ان کے لیے تعلیم و تعلّم اور ارشاد و ہدایت کا ذریعہ بنتی اور نہ تم سے پہلے ان کے پاس کوئی نذیر آیا تھا جو ان کو اس غفلت کی نیند سے جگاتا اور آگے کے خطرات سے آگاہ کرتا۔ اس صورتِ حال کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس عظیم نعمت کی یہ دل و جان سے قدر کرتے، آگے بڑھ کر اس کو ہاتھوں ہاتھ لیتے اور اس سے اپنی دنیا بھی سنوارتے اور آخرت کی بادشاہی بھی حاصل کرتے لیکن یہ اس کی مخالفت کر رہے ہیں اور اس طرح خدا کے اس قہر کو دعوت دے رہے ہیں جو سنتِ الٰہی کے مطابق اس قوم پر آکے رہتا ہے جو اس کے بھیجے ہوئے نذیر کو جھٹلا دیتی ہے۔

'کُتُبٌ' کے بعد 'یَدْرُسُوْنَہَا' کی صفت سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اب تک ان کو اس طرح کے آسمانی صحیفے نہیں عطا ہوئے تھے جس طرح کے صحیفے بنی اسرائیل کو عطا ہوئے کہ یہ ان کو پڑھتے پڑھاتے۔ حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام کے ذریعے سے ان کو جو تعلیم ملی تھی اس کی نوعیت روایات کی تھی جو امتدادِ زمانہ سے تقریباً فراموش بھی ہو چکی تھیں اور بدعات کے غلبہ نے ان کا حلیہ بھی بالکل بگاڑ کے رکھ دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ ان کو اپنی کتاب دے کر ان پر اپنی نعمت تمام کر دے لیکن اُن کا حال یہ ہے کہ یہ اس کو سحر اور افترا قرار دے رہے ہیں۔

وَکَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِہِمْ ۙ وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَیْنٰہُمْ فَکَذَّبُوْا رُسُلِیْ قف فَکَیْفَ کَانَ نَکِیْرِ (۴۵)

یہ ان لوگوں کو تنبیہ ہے کہ خدا کے رسول اور اس کے نذیر کی تکذیب کا لازمی نتیجہ اس قوم کی تباہی ہے اور پوری تاریخ انسانی اس سنتِ الٰہی کی شاہد ہے۔

خدا کے نذیر کی تکذیب کا لازمی نتیجہ

'وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَیْنٰہُمْ' کلام کے بیچ میں ایک برمحل تنبیہ ہے کہ یہ ان قوموں کا حوالہ دیا جا رہا ہے جو کرّ و فر، شان و شوکت اور اسباب و وسائل کی فراوانی کے اعتبار سے اس مقام پر پہنچ چکی تھیں کہ قریش کے یہ متمردین ان کی گردِ پا کو بھی نہیں پہنچے۔ لیکن جب انھوں نے اللہ کے رسولوں کی تکذیب کی تو ان پر خدا کی پھٹکار جس طرح ہوئی اس کی تفصیلات قرآن میں بیان ہو چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان کو اپنے اسباب و وسائل کا غرّہ ہے تو یہ غرّہ بالکل بے بنیاد ہے۔ بڑی صولت و شوکت کی قومیں خدا کی ایک پھونک میں اڑ گئیں تو ان کی کیا حقیقت ہے۔ ان کو تو ان کا عُشرِ عشیر بھی حاصل نہیں ہوا۔ یہ تو اپنی تنگ ظرفی کے سبب سے بہت تھوڑے میں بہک گئے ہیں۔

۱۰۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۴۶-۵۴

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں مخالفین کو نہایت دردمندی کے ساتھ نصیحت بھی ہے اور نہایت پُر زور وعید بھی کہ ابھی موقع ہے کہ سنبھل جاؤ۔ اگر یہ وقت نکل گیا تو پھر گیا وقت ہاتھ نہیں

آئے گا۔ اس وقت پچھتاؤ گے لیکن یہ پچھتانا بالکل بے سود ہوگا۔ آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۴۶-۵۴

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۫ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ﴿۴۶﴾ قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۴۷﴾ قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَقْذِفُ بِالْحَقِّ ۚ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۴۸﴾ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ ﴿۴۹﴾ قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِيْ ۚ وَاِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِيْٓ اِلَيَّ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ ﴿۵۰﴾ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَاُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿۵۱﴾ وَّقَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖ ۚ وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ ﴿۵۲﴾ وَّقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۚ وَيَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ ﴿۵۳﴾ وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ﴿۵۴﴾

ع ۶ / ۱۲

ترجمہ آیات ۴۶-۵۴

ان سے کہو، میں تمھیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں، وہ یہ کہ تم اللہ کی خاطر دو دو اور ایک ایک کر کے اٹھو پھر غور کرو۔ تمھارے ساتھی کو کوئی جنون نہیں ہے۔ وہ تو ایک شدید عذاب سے پہلے تم کو آگاہ کرنے والا ہے۔ کہو، میں نے تم سے کوئی اجر مانگا ہے تو تمھارے ہی لیے مانگا ہے۔ میرا اجر تو بس اللہ پر ہے اور وہ ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے۔ ۴۶ - ۴۷

کہہ دو، میرا رب حق کو (باطل پر) مارے گا۔ وہ تمام بھیدوں کو خوب جاننے والا ہے۔

کہہ دو کہ حق آگیا اور باطل نہ آغاز کرتا ہے اور نہ اعادہ۔ ۴۸ - ۴۹

کہہ دو اگر میں گمراہی پر ہوں تو میری گمراہی کا وبال مجھی پر ہے اور اگر میں ہدایت پر ہوں تو یہ اس وحی کی بدولت ہے جو میرا رب میری طرف بھیج رہا ہے۔ وہ سننے والا اور نہایت قریب ہے۔ ۵۰

اور اگر تم دیکھ پاتے جب ان پر گھبراہٹ طاری ہوگی پس وہ کہیں بھاگ نہ سکیں گے اور پاس ہی سے دھر لیے جائیں گے اور وہ کہیں گے ہم اس پر ایمان لائے۔ اور اتنی دور سے ان کے لیے اس کا پانا کہاں! اور اس سے پہلے انھوں نے اس کا انکار کیا اور دور سے اٹکل کے تیر تکے چلاتے رہے اور ان کے اور ان کی چاہتوں کے درمیان دیوار حائل ہو جائے گی جس طرح اس سے پہلے ان کے ہم مشربوں کے ساتھ معاملہ ہوا۔ بے شک وہ بھی الجھن میں ڈالنے والے شک میں پڑے رہے۔ ۵۱ - ۵۴

۱۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۚ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ (۴۶)

ایک دل دوز نصیحت

پچھلے آیات ۷ - ۸ میں گزر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنی قوم کے متمردین کو عذاب قیامت سے ڈراتے تو وہ آپ کی اس بات کو ایک قسم کے خبط پر محمول کرتے۔ کہتے کہ اس شخص کو ایک قسم کا مالیخولیا ہے جس کے سبب سے آگے پیچھے اس کو عذاب ہی عذاب نظر آتا ہے۔ اسی کا جواب دیتے ہوئے نہایت ناصحانہ انداز میں فرمایا کہ ان سے کہو کہ میں تم سے ایک بات کہتا ہوں، خدارا اس پر عمل کرو۔ وہ یہ کہ اپنے ذہن کو ضد، تعصب اور غرور سے پاک کر کے، دو دو، ایک ایک، کی صورت میں اٹھو، میری باتیں سنو اور معاملے پر سنجیدگی سے غور کرو۔ 'لِلّٰهِ' سے مقصود اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ اب تک تو تمھاری روش تمام تر نفس اور شیطان کے تابع رہی ہے اس وجہ سے تم معاملے پر غیر جانبدار ہو کر غور نہ کر سکے لیکن آدمی پر سب سے بڑا حق اللہ تعالیٰ کا ہے اور اللہ کو تم بھی مانتے ہو تو اس کی خاطر اپنے دوسرے

واعیات و محرکات سے آزاد ہو کر، اصل حقیقت پر غور کرنے کے لیے از سرِ نو اٹھو۔ 'اٹھو'، یعنی اس کا ارادہ کرو اور اس کے لیے کمرِ ہمت باندھو۔ تعصّبات کی اس فضا میں یہ بات ہو گی تو تمھارے دلوں پر شاق، لیکن اللہ کے لیے اس شاق چیز کو گوارا کرو۔ یہی راہ سعادت کی راہ ہے۔

'مَثْنٰی وَفُرَادٰی' کی قید سے اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ بھیڑ کا ذہن حقائق کو سوچنے سمجھنے کا اہل نہیں ہوتا۔ اب تک تو تمھاری روش یہ رہی ہے کہ جہاں میری زبان سے کوئی بات نکلی تمھارے اشرار نے اس کے خلاف ہنگامہ برپا کرنے کی کوشش کی کہ کوئی میری بات سننے سمجھنے نہ پائے۔ یہ طریقہ چھوڑو اور اس کی جگہ یہ طریقہ اختیار کرو کہ دو دو اور ایک ایک کر کے میرے پاس آؤ، میری باتیں توجہ سے سنو، میرے دلائل پر غور کرو، اپنے شبہات پیش کر کے مجھ سے ان کے جواب معلوم کرو اور پھر غور کرو کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں جنون میں کہہ رہا ہوں یا تمھارے سامنے وہ انجام رکھ رہا ہوں جس سے کل تمھیں لازماً دوچار ہونا ہے۔

'مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ': یعنی اس طرح سنجیدگی کے ساتھ غور کرو گے تو تم پر یہ حقیقت خود واضح ہو جائے گی کہ تمھارے ساتھی کو کوئی جنون نہیں ہے بلکہ خود تمھاری اپنی عقلوں پر پردہ پڑا ہوا ہے کہ تم اس کے خلاف جتھہ بندی کر کے اس کو زچ کرنے کے درپے ہو۔

لفظ 'صاحب' یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جس شخص کو تم خبطی اور دیوانہ قرار دے رہے ہو اس سے تمھیں کوئی نیا نیا سابقہ پیش نہیں آیا ہے بلکہ یہ تمھارے ہی اندر پیدا ہوا، تمھارے ہی سامنے پلا اور بڑھا اور تمھارے ہی آگے یہ اپنی اس عمر کو پہنچا۔ اس پورے زمانے میں تم نے دیکھا کہ یہ تمھارے ہر خیر میں شریک اور تمھارے ہر شر سے مجتنب رہا ہے۔ تم نے ہر آزمائش میں اس کو صادق اور امین پایا۔ اس کی سوجھ بوجھ اور اس کی عقل و بصیرت پر تم نے اعتماد کیا اور اس کو اپنے اندر سب سے بڑا عاقل و فرزانہ مانتے رہے لیکن آج اسی فرزانہ کو دیوانہ قرار دے رہے ہو! غور کرو، دیوانہ وہ ہے یا تم!

ایک بلیغ وقفہ

یہاں 'تَتَفَكَّرُوْا' کے بعد وقف ہے اور یہ وقف نہایت بلیغ ہے۔ گویا غور و فکر کی دعوت کے بعد لوگوں کو غور و فکر کے لیے تھوڑا سا وقت بھی دے دیا۔ اس کے بعد اس غور و فکر کا جو صحیح نتیجہ نکلنا چاہیے وہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ اس قسم کے وقف کی متعدد مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں۔

پیغمبر کی بے قراری کی اصلی وجہ

'اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ'۔ یہ بات بھی یہاں نہایت برمحل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو تم دیکھتے ہو کہ اس کے دل و دماغ پر ایک ہی فکر، عذاب اور آخرت کی، ہر وقت سوار ہے۔ اٹھتے بیٹھتے ہر لمحہ وہ تم کو اسی سے ڈراتا اور اسی کے لیے تیاری کرنے کی نصیحت کرتا ہے۔ تمھاری تمام ناقدریوں، دل آزاریوں اور ستم رانیوں کے باوجود تمھارے پیچھے پھرتا ہے تو اس کی یہ بے قراری

بھی اس وجہ سے نہیں ہے کہ اس کو کوئی جنون لاحق ہے بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ جو عذاب تمھارے سروں پر منڈلا رہا ہے وہ اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے لیکن تمھیں وہ نظر نہیں آ رہا ہے۔ اس کی یہ ساری بے چینی و بے قراری تمھاری ہمدردی میں ہے لیکن تم اپنے اندھے پن کے سبب سے اس کی ان بے چینیوں اور بے قراریوں کو خبط و جنون پر محمول کرتے ہو۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ ایک رسول کو اپنی قوم پر آنے والے عذاب کا نظر آنا کوئی مجاز نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ رسول اپنی قوم کے لیے رحمت کی گھٹا بن کر آتا ہے لیکن اس رحمت کی گھٹا کے اندر ہی اس کی قوم کے لیے صاعقۂ عذاب بھی پوشیدہ ہوتا ہے اگر قوم اس کی تکذیب کر دیتی ہے۔ یہی عذاب آخرت کے عذاب کا دیباچہ ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ہر رسول نے اپنی قوم کو ان دونوں عذابوں سے ڈرایا ہے اور اس یقین کے ساتھ ڈرایا ہے کہ گویا وہ اپنی دونوں آنکھوں سے اس عذاب کو دیکھ رہا ہو۔ لیکن عقل کے اندھوں نے اس کے اس یقین کو جنون پر محمول کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہ صفا پر چڑھ کر 'وا صباحا!' کا جو نعرہ لگایا وہ اسی یقین کا مظاہرہ تھا لیکن قریش کے لیڈروں نے اس سے متنبہ ہونے کے بجائے اس کا مذاق اڑایا۔

قُلْ مَا سَاَلْتُکُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَھُوَ لَکُمْ ط اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ ج وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَھِیْدٌ (۴۷)

ایک ہی حقیقت دو مختلف اسلوبوں سے — یہ مضمون قرآن میں دو اسلوبوں سے آیا ہے اور دونوں کا مفاد ایک ہی ہے۔

ایک اسلوب یہ ہے کہ میں نے اپنی خدمت پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگا ہے کہ تم مجھ سے بدک رہے ہو، میرا اجر تو بس میرے رب ہی کے ذمہ ہے۔

دوسرا یہ کہ اگر میں نے تم سے کوئی بات چاہی ہے جس کو تم اجر سمجھتے اور بار محسوس کرتے ہو تو وہ اپنے لیے نہیں بلکہ تمھاری ہی دنیا و آخرت کی بہبود کے لیے چاہی ہے۔

پہلے اسلوب کی مثالیں بکثرت ہیں۔ ان کے حوالے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں یہ مضمون اس دوسرے اسلوب میں بیان ہوا ہے جس کی بعض نظیریں ہم نقل کرتے ہیں۔ سورۂ فرقان میں ہے:

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ یَّتَّخِذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِیْلًا (۵۷)

کہہ دو کہ میں نے اس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگا ہے، مگر یہ کہ جو چاہے اپنے رب کی راہ اختیار کرے۔

اگرچہ اس آیت کی تاویل پہلے اسلوب کے مفہوم میں بھی ہو سکتی ہے اور وہ بھی عربیت کے خلاف نہیں ہوگی لیکن اس کا یہ مطلب بھی بالکل واضح ہے کہ میں نے اپنی اس خدمت پر تم سے اپنے لیے کچھ نہیں چاہا ہے۔ اگر چاہا ہے تو تمھارے ہی لیے چاہا ہے کہ تم میں سے جو خدا کی راہ کا طالب ہو میں اس کو خدا کی صراطِ مستقیم دکھا دوں۔

اسی طرح سورۂ شوریٰ میں ہے:

قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى ۚ (۲۳)

کہہ دو کہ میں اس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا مگر یہ کہ قرابت مندوں کے معاملے میں حسنِ سلوک کی روش اختیار کرو۔

اگرچہ اس آیت کی تاویل بھی پہلے اسلوب کی روشنی میں ہو سکتی ہے، اس پر اس کے محل میں ہم بحث کریں گے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی بالکل واضح ہے کہ اگر تم میری دعوت انفاق و صلۂ رحم کو بار سمجھتے ہو تو یہ بھی میں اپنے لیے نہیں بلکہ تمھارے ہی لیے اور تمھارے رشتہ داروں و قرابت مندوں ہی کے لیے چاہتا ہوں۔

اسی اسلوب پر آیت زیرِ بحث میں فرمایا کہ اول تو میں نے اپنی اس دعوت و تعلیم پر تم سے کسی اجر کا مطالبہ کیا نہیں، میرا اجر میرے رب کے ذمہ ہے؛ لیکن اگر تم میرے کسی مطالبے کو اپنے اوپر بار اور اس کو میرا اجر تصور کرتے ہو تو یہ تمھاری غلط فہمی و کج اندیشی ہے۔ میں نے تم سے جو کچھ بھی چاہا ہے اپنے لیے نہیں بلکہ تمھارے ہی لیے چاہا ہے۔ میں تمھیں خدا اور آخرت سے جو ڈراتا ہوں، نیکی کی تلقین کرتا ہوں، انفاق فی سبیل اللہ، اطعام فقرا و یتامیٰ اور غلاموں کو آزاد کرنے پر ابھارتا ہوں تو ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس میں میرا کوئی ذاتی مفاد ہو بلکہ ان کا فائدہ، انفرادی و اجتماعی دونوں پہلوؤں سے، تمھی کو حاصل ہوگا۔ تم ان باتوں پر عمل کر کے اپنی دنیا بھی سنوارو گے اور اپنی آخرت بھی بناؤ گے۔

یہ بات قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی فرمائی گئی ہے مخاطبوں کو ملامت اور ان سے اظہارِ بے نیازی کے سیاق ہی میں فرمائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان ناقدروں سے کہہ دو کہ میں نے اپنی دعوت پر کوئی ٹکٹ یا چندہ تو نہیں لگا رکھا ہے کہ وہ تمھارے لیے میرے پاس آنے اور میری بات سننے میں مانع ہو رہا ہو، تم ہر وقت میرے پاس آ سکتے ہو اور بے جھجک آ سکتے ہو۔ میری مجلس میں کسی پر کوئی قدغن نہیں۔ تمھارے امیر و غریب سب کے لیے میرا دروازہ کھلا ہوا اور میرا سینہ کشادہ ہے۔ اور اگر نہیں آتے تو یاد رکھو کہ میرا کچھ نہیں بگاڑو گے، اپنا ہی بگاڑو گے۔ میں نے کوئی دکان نہیں کھولی ہے کہ تمھاری بے التفاتی سے میری دکان بیٹھ جائے گی۔ میں نے تو اپنے رب سے مفت پایا ہے، مفت بانٹ رہا ہوں۔

'وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ'۔ یعنی میرا اجر جس اللہ کے ذمہ ہے وہ ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے۔ مجھے یہ اندیشہ نہیں ہے کہ میری کوئی حقیر سے حقیر خدمت بھی اس سے پوشیدہ رہے گی۔ وہ میری سرگرمیاں بھی دیکھ رہا ہے اور تمھاری ناقدریاں بھی اس کی نگاہوں میں ہیں۔ میں پورا بھروسہ رکھتا ہوں کہ وہ مجھے میری خدمات کا بھرپور صلہ دے گا۔

قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَقْذِفُ بِالْحَقِّ ۚ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ (۴۸)

ایک تنبیہ: 'یَقْذِفُ بِالْحَقِّ' کے بعد 'عَلَى الْبَاطِلِ' کے الفاظ بربنائے قرینہ محذوف ہیں، جیسا کہ دوسرے مقام میں

فرمایا ہے۔ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ (الانبیاء: ۱۸) (ہم حق کو باطل پر ماریں گے پس وہ اس کا بھیجا نکال کے رکھ دے گا)۔

یعنی ان نادانوں کو بتادو کہ اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ یہ دنیا یوں ہی پیدا ہوئی، یوں ہی تمام ہو جائے گی بلکہ ایک ایسا دن لازماً آنے والا ہے جس دن اس کا خالق اس کے حق و باطل میں فیصلہ فرمائے گا اور حق کو باطل پر مارے گا جس سے باطل پاش پاش ہو کے رہ جائے گا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اصلاً تو یہ بات آخرت کی عدالتِ کبریٰ سے متعلق ہے لیکن یہی نتیجہ اس عدالتِ صغریٰ کا بھی برآمد ہوتا ہے جو ایک رسول کی بعثت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ ہم جگہ جگہ اس سنتِ الٰہی کی وضاحت کر چکے ہیں کہ جس قوم کی طرف رسول کی بعثت ہوئی اس قوم کے حق و باطل کا فیصلہ لازماً ہو گیا۔ چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر حضورؐ نے اعلان فرمایا کہ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (حق آگیا اور باطل نابود ہوا، بے شک باطل نابود ہی ہونے والی چیز ہے)۔

عَلَّامُ الْغُيُوبِ۔ ہمارے نزدیک یہ مستقل جملہ ہے اور مبتدا یہاں محذوف ہے۔ یہ حق و باطل کے درمیان عدالت کی دلیل صفاتِ الٰہی سے پیش کی گئی ہے کہ اس کائنات کا رب تمام غیب کی باتوں کو جانتا ہے، کوئی چیز بھی اس سے مخفی نہیں ہے، اس وجہ سے کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اس کو کسی چیز کا فیصلہ کرنے میں کوئی زحمت پیش آئے گی۔ وہ ہر ایک کا پورا اعمال نامہ اس کے آگے رکھ دے گا جس میں اس کا ہر عمل درج ہوگا خواہ وہ کتنے ہی پوشیدہ گوشوں میں انجام دیا گیا ہو۔

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ (۴۹)

جس طرح اوپر کی آیت میں 'يَقْذِفُ بِالْحَقِّ' کے بعد 'زَهَقَ الْبَاطِلُ' کے الفاظ حذف ہیں اسی طرح یہاں 'جَآءَ الْحَقُّ' کے بعد 'زَهَقَ الْبَاطِلُ' کے الفاظ حذف ہیں اور اس خلا کو 'وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ' کے الفاظ نے بھر دیا ہے۔

باطل ایک بے ثبات چیز ہے

فرمایا کہ ان نادانوں کو بتا دو کہ اب حق قرآن کی شکل میں آگیا اور جب حق آگیا تو اس باطل کا نابود ہونا لازمی ہے جس کی وہ پرستش کرتے رہے ہیں۔ اب اگر وہ اس باطل کے ساتھ چمٹے رہے تو اس کے ساتھ وہ بھی پس جائیں گے۔

جن کا اس کائنات کے ابداء میں دخل نہیں ان کا اس کے اعادہ میں بھی کوئی دخل نہیں

'وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ'۔ یہ باطل کی بے ثباتی کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ اس کارخانۂ کائنات کا آغاز اس کے خالق نے حق کے ساتھ فرمایا ہے اس وجہ سے لازم ہے کہ اس کی انتہا بھی حق پر ہو۔ جب باطل کا کوئی دخل اس کے ابداء میں نہیں ہے تو اس کے اعادہ میں اس کا دخل کس طرح ہو جائے گا؟ پس جو لوگ فرضی دیویوں دیوتاؤں کی سفارشوں پر تکیہ کیے ہوئے زندگی گزار رہے ہیں یاد رکھیں کہ ان کے دیوتاؤں کے اختیار میں نہ کسی چیز کا ابداء ہے نہ اعادہ۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکینِ عرب اس کائنات

کے ابدا میں کسی کو شریک نہیں مانتے تھے لیکن وہ اس بات کے قائل تھے کہ اگر آخرت کا مرحلہ پیش آیا تو ان کی واپسی ان کے معبودوں کی طرف ہوگی جو اپنی سفارشوں سے ان کو وہاں بھی اعلیٰ مراتب دلوائیں گے قرآن نے ان کی اسی غلط فہمی کے ازالہ کے لیے جگہ جگہ ان کے اس مغالطہ پر گرفت کی ہے کہ جب تم اس کائنات کے ابدا میں کسی کو شریک نہیں مانتے تو اس کے اعادہ میں کیوں شریک مانتے ہو؟

سورۂ یونس میں یہی مضمون اس طرح بیان فرمایا ہے:

اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ۭ وَعْدَ	اسی کی طرف تم سب کی واپسی ہونی ہے۔ یہ اللہ
اللّٰهِ حَقًّا ۭ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ	کا شدنی وعدہ ہے۔ بے شک وہی خلق کا آغاز فرماتا
ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ	ہے پھر وہ اس کا اعادہ فرمائے گا تاکہ وہ ان لوگوں کو
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ۭ	انصاف کے ساتھ بدلہ دے جو ایمان لائے اور جنھوں
(یونس : ۴)	نے نیک اعمال کیے۔

پھر یہی مضمون دوسرے اسلوب سے یوں بیان ہوا ہے:

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَاۗىِٕكُمْ مَّنْ	ان سے پوچھو تمھارے شرکاء میں سے کوئی ہے
يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۭ	جو خلق کا آغاز کرتا ہے پھر وہ اس کا اعادہ کرے گا؟
فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝	کہہ دو، اللہ ہی خلق کا آغاز کرتا ہے پھر وہ اس کا
(یونس : ۳۴)	اعادہ کرے گا۔ تو تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو!

قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰي نَفْسِيْ ۚ وَاِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِيْٓ اِلَيَّ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ (۵۰)

وحی الٰہی کی تکذیب کا انجام

اب یہ ان لوگوں کو تنبیہ فرمائی کہ ان سے کہہ دو کہ اگر میں گمراہ ہوں، جیسا کہ تم سمجھتے ہو تو اس گمراہی کا خمیازہ بہرحال مجھ ہی کو بھگتنا ہے، تم اس کے وبال سے محفوظ ہو اس لیے کہ تم اس میں میرا ساتھ نہیں دے رہے ہو۔ لیکن اس مسئلہ کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اس پر بھی اچھی طرح غور کر لو۔ وہ یہ کہ اگر میں ہدایت پر ہوں تو یہ ہدایت اس وحی کی بدولت مجھے حاصل ہوئی ہے جو میرا پروردگار مجھ پر نازل فرما رہا ہے۔ اس صورت میں میری تکذیب تمھارے لیے کوئی سہل چیز نہیں ہے بلکہ تم وحی الٰہی کے جھٹلانے والے ٹھہرتے ہو اور وحی الٰہی کی تکذیب کرنے والوں کا جو انجام ہونا چاہیے اور ہوگا وہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے نتائج و عواقب کو بہت دور تک سوچ لو!

تفویض الی اللہ

اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ: یہ تفویض الی اللہ کا کلمہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تم سے زیادہ بحث و جدال بے سود ہے۔ میں یہ آخری بات کہہ کے تمھارا معاملہ اپنے رب کے حوالے کرتا ہوں۔ تم نہ تو میری بات سننے کے لیے تیار ہو، نہ قریب آنے کے روادار ہو لیکن میرا رب میری باتیں سننے والا بھی ہے اور قریب بھی ہے۔ تو اب تمھارے پیچھے سر کھپانے کے بجائے اسی سے عرض معروض کروں گا جو سنتا اور قبول فرماتا ہے۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَاُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ (۵۱)

فیصلہ کن گھڑی

یہاں جوابِ شرط محذوف ہے۔ اس کی مثال آیت ۳۱ میں گزر چکی ہے۔ اس طرح جوابِ شرط کا محذوف ہونا اس بات کی دلیل ہوتا ہے کہ جواب تعبیر و تصویر سے مافوق ہے۔ فرمایا کہ آج تو ان کے استکبار کا یہ حال ہے کہ پُٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دے رہے ہیں لیکن اگر کہیں تم ان کے اس وقت کو دیکھ پاتے جب کہ وہ خدا کی اس گرفت میں آجائیں گے جس کو آج جھٹلا رہے ہیں تب تم کو ان کی بے بسی کا کچھ اندازہ ہوتا کہ کس طرح یہ ناک رگڑتے اور حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔ فرمایا کہ جب یہ خدا کے عذاب کی پکڑ میں آئیں گے تو گھبرا کر بھاگنے اور بچنے کی کوشش کریں گے لیکن خدا کی گرفت سے کون بچ سکتا ہے جو یہ اس سے بھاگ سکیں گے۔ 'وَاُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ' یعنی یہ بھاگنا چاہیں گے لیکن پاس ہی سے دھر لیے جائیں گے۔ ان کے پاؤں کے نیچے یا ان کے سر کے اوپر سے اس طرح خدا کا عذاب ان کو اپنے قابو میں کرے گا کہ کسی طرف بھی ان کو راہِ فرار سجھائی نہیں دے گی۔

وَّقَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖ ۚ وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ (۵۲)

یعنی اس وقت ان کا سارا نشہ ہرن ہو جائے گا اور وہ پکار اٹھیں گے کہ اب ہم اس قرآن پر ایمان لائے۔ ضمیر کا مرجع یہاں قرآن ہے جس کا ذکر اوپر کی آیات میں گزر چکا ہے۔ قرآن کو پیش کرنے والے یعنی آنحضرتؐ از خود اس میں شامل ہیں۔

بعد از وقت ایمان:

'وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ' یعنی ایمان کا محل تو یہ دنیا ہے اور وہ بھی عذابِ الٰہی کے ظہور سے پہلے تو جب عذابِ الٰہی ظاہر ہو جائے گا اس وقت تو یہ ایمان کی منزل سے اتنی دُور نکل جائیں گے کہ وہاں سے ان کے لیے اس کے پا سکنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جائے گا۔ عذابِ الٰہی کی گرفت میں آجانے کے بعد تو فرعون جیسا سرکش بھی پکار اٹھا تھا کہ میں موسیٰ و ہارون کے رب پر ایمان لایا! لیکن اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ جواب ملا کہ 'آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ' (اب ایمان لائے! حالانکہ جب ایمان لانے کا وقت تھا تو تم نے نافرمانی کی)۔

'تناوش' کے معنی پا لینے کے ہیں اور 'اَنّٰى لَهُمُ' کا مفہوم یہ ہے کہ بھلا اس وقت اس کے پانے کا کیا امکان ہوگا!

دست کوتاہ است و خرما بر نخیل

وَقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۚ وَيَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ (۵۳)

'قذف بالحجارۃ' کے معنی ہیں پتھر پھینکا۔ 'قذف بالقول' تکلم بلا تدبر ولا تامل۔ یعنی بے سوچے سمجھے بات پھینک ماری۔ یہیں سے یہ 'رجماً بالغیب' یعنی اٹکل پچو بات کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عذاب دیکھنے کے بعد وہ ایمان کا اقرار کریں گے حالانکہ اس سے پہلے وہ دور سے

بیٹھے ہوئے اٹکل کے تیر تُکے چلاتے رہے تھے کہ یہ کتاب من گھڑت ہے، اس کا پیش کرنے والا (العیاذ باللہ) برخود غلط ہے، عذاب کی دھمکی محض دھونس ہے، قیامت کا ڈراوا محض خلل دماغ کا نتیجہ ہے اور اگر قیامت کا کوئی مرحلہ پیش آیا تو ہمارے شرکاء کے طفیل ہمارا تفوق وہاں بھی قائم رہے گا۔ الغرض عقل کو بالائے طاق رکھ کے قرآن اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تکذیب کے جنون میں جو کچھ زبان پر آیا بکتے رہے لیکن جب حقیقت سامنے آجائے گی تو اس کا اقرار کریں گے لیکن یہ اقرار بعد از وقت اور بالکل بے سُود ہوگا۔

وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِیْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ (۵۴)

امید کے تمام دروازے بند

یعنی جب فیصلہ کن عذاب نمودار ہو جائے گا تو ان کے اور ان کی تمام چاہتوں کے مابین دیوار حائل ہو جائے گی۔ وہ ایمان لانا چاہیں گے لیکن ان کا یہ چاہنا بے سود ہوگا۔ وہ مہلت کی درخواست کریں گے لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوگی۔ وہ اپنے شریکوں کو پکاریں گے لیکن ان کی طرف سے بھی ان کی کوئی فریاد رسی نہیں ہوگی۔ غرض امید کے تمام دروازے ان پر بند ہو جائیں گے اور ایک ابدی مایوسی سے ان کو سابقہ پیش آئے گا۔

'كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ' یعنی ان کو بھی اسی صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑے گا جس سے ان کے پیشرو ہم مشربوں کو دوچار ہونا پڑا۔ یہ اشارہ عاد، ثمود، اہلِ مدین اور فرعون وغیرہ کی طرف ہے جن کی سرگزشتیں تفصیل کے ساتھ قرآن میں سنائی جا چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس سے پہلے پیش نہ آچکی ہو۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان تمام قوموں کو اسی افتاد سے سابقہ پیش آیا جنھوں نے ان کی طرح اپنے رسولوں کے انذار کی تکذیب کی۔ اگر یہ ان کے حالات سے سبق نہیں لیتے تو لازماً انہی کے انجام سے دوچار ہوں گے۔

'اِنَّهُمْ كَانُوْا فِیْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ'۔ یعنی وہ بھی انہی کی طرح الجھن میں ڈالنے والے شک میں پڑے رہے یہاں تک کہ بالآخر فیصلہ کن گھڑی سر پر آہی گئی۔ 'شَكٍّ مُّرِيْبٍ' کی نوعیت پر ھود ۱۱: ۶۲ میں ہم گفتگو کر چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے، ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ۔

رحمان آباد: ۳/ جنوری ۱۹۷۵ء

جمعہ - ۹ بجے دن